۱۶ فروری و یکم مارچ ۲۰۲۰ء | جلد نمبر: ۱۳ ۔ شمارہ نمبر: ۴۔۵

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سیّد سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد حمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

۱ ۔ معارف فیچر ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ معارف فیچر کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ معارف فیچر کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

تیونس: قابلِ مثال

Sarah E. Yerkes

تیونس کے انقلاب کا آغاز کیسے ہوا، یہ سب کے علم میں ہے۔ ۱۷ دسمبر ۲۰۱۰ء کو تیونس کے قصبے سیدی بوزید سے تعلق رکھنے والے پھل فروش ''محمد بوعزیزی'' نے مقامی حکومتی دفتر کے سامنے خود کو آگ لگا لی۔ پولیس اور مقامی انتظامیہ کی مستقل بدسلوکی کی وجہ سے اس شخص نے خود سوزی کی تو حکومت مخالف مظاہرے تیزی سے پورے ملک میں پھیل گئے۔ کچھ ہی ہفتوں میں صدر زین العابدین ملک سے فرار ہو گئے، جو کہ گزشتہ ۲۳ برسوں سے اقتدار میں تھے۔ ان کے فرار نے تیونس کو ایک نئے آغاز کا موقع فراہم کر دیا۔ بہت جلد بغاوتوں کی لہر نے پڑوسی ممالک کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا، یہ لہر شام سے خلیج فارس تک پہنچی۔

جو بات کم لوگوں کے علم میں ہے وہ یہ کہ تیونس میں اس انقلاب کے بعد کیا ہوا۔ اگرچہ ''عرب بہار'' کا آغاز تیونس سے ہوا تھا، لیکن یہاں آنے والی تبدیلیاں زیادہ عرصے تک لوگوں کی نظروں میں نہ رہ سکیں۔ کیونکہ عرب بہار کی زد میں آنے والے وہ ممالک زیادہ نمایاں ہو گئے، جن کی آبادی زیادہ تھی یا جن کے امریکا سے قریبی تعلقات تھے اور جہاں کے حکمران ظلم و جبر میں بھی آگے تھے۔ تاہم تقریباً ایک دہائی کے عرصے میں تیونس واحد ملک ہے، جو عرب بہار کے مثبت ثمرات سمیٹ رہا ہے۔ عرب دنیا کے وہ تمام ممالک جو عرب بہار کے حوالے سے تیونس کے نقش قدم پر چلے تھے، تقریباً سب ہی خانہ جنگی کا شکار ہو گئے، جیسا کہ لیبیا، شام اور یمن۔ باقی بحرین، شام اور مصر دوبارہ آمریت کی طرف لوٹ گئے۔ اس کے برعکس تیونس نے ایک متوازن آئین تیار کیا، اس کے ساتھ ساتھ صدارتی، پارلیمانی اور مقامی سطح پر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات بھی کروائے گئے۔ جولائی ۲۰۱۹ء میں صدر باجی قائد السبسی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد نگراں حکومت کا قیام بغیر کسی رکاوٹ کے عمل میں لایا گیا۔ کچھ مسائل ابھی تک موجود ہیں جو کہ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں، جیسا کہ معاشی بدانتظامی اور سرکاری اداروں پر عوامی اعتماد کی کمی۔ لیکن ان مسائل کے باوجود تیونس پورے خطے میں امید کی ایک کرن ثابت ہوا ہے۔ ان کامیابیوں کے حصول کے دوران تیونس نے اس افسانوی نقطۂ نظر کو بھی مسترد کرنے میں مدد دی کہ عرب معاشرہ اور اسلام جمہوریت سے مطابقت نہیں رکھتے۔ لیکن تیونس نے نہ صرف عرب دنیا کو بلکہ بقیہ ممالک کو بھی پیغام دیا ہے کہ آمریت سے جمہوریت تک کے سفر کے لیے ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے، جو ملکی مفاد کو سیاسی مفادات پر ترجیح دیتے ہوں۔ عالمی برادری کو بھی چاہیے کہ وہ جمہوریت کی جانب قدم اٹھانے والے ممالک کی نہ صرف سفارتی حمایت کرے بلکہ انھیں مالی امداد بھی دے تاکہ وہ اس راستے میں حائل رکاوٹوں کو آسانی سے برداشت کر سکیں۔

انقلاب کے آفٹر شاکس

انقلاب کے بعد تیونس ناگفتہ بہ حالت میں تھا۔ بن علی کی حکومت بدعنوانی میں اپنا نام رکھتی تھی۔ بن علی نے حکومتی وسائل کو بے دردی سے لوٹ کر اپنی بیوی ''لیلیٰ ترابلسی'' کے اکاؤنٹ بھر دیے۔ حکومت نے اپنی توجہ چند ساحلی علاقوں پر مرکوز رکھی، ملک کے جنوبی اور داخلی حصوں کو یکسر نظر انداز کیے رکھا اور پھر ان ہی علاقوں سے بغاوت ہوئی۔ بن علی کے لیے سیاسی مسابقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ حزب اختلاف کی جماعتوں پر یا تو پابندیاں تھیں یا پھر انھیں مخصوص دائرے میں کام کرنے کی اجازت تھی اور جو بھی حکومت کے خلاف کوئی بات کرتا، اسے تشدد کا نشانہ بنا کر یا پابند سلاسل کر دیا جاتا تھا۔

جس طرح کے حالات میں بن علی ملک سے فرار ہوئے، ان کے جانے کے بعد ملک کو انتہائی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ عوامی زندگی میں مذہب کے کردار پر بحث زور و شور سے جاری تھی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کی ۹۹ فیصد آبادی سُنّی ہے، وہاں بن علی اس بات پر بہت غرور کیا کرتے تھے کہ ان کا ملک سیکولر ہے اور خواتین کو ہر طرح کے حقوق حاصل ہیں۔ ۸۰ء کی دہائی میں ایک معروف اسلامی تحریک نے سر اٹھایا تو بن علی نے فوراً ہی اس تنظیم پر پابندی لگا کر اس کے راہنماؤں اور ہزاروں کارکنان کو جیلوں میں بند کر دیا اور بہت سے

اندرونی صفحات پر

- روس: امریکا اور ایران تنازع کا واحد فاتح
- جنوب مشرقی ایشیا میں چین کا بڑھتا اثر و رسوخ
- چینی زبان میں روڈ سائن، استنبول میں ہنگامہ
- امریکیوں کی ''معصومیت'' رخصت ہوئی
- بھارتی مسلمانوں کے ووٹ کی حقیقت
- مستقبل کا فلسطین: دبئی یا لبنان؟
- مسلم دنیا کی سیاست
- بھارت جنگ چھیڑنے کے دہانے پر!
- اسرائیلی فوجی اہلکار تو بڑے ہی بے وقوف نکلے!

راہنماؤں کو جلاوطن کر دیا۔ لیکن جب ۲۰۱۱ء میں تیونس کے عوام نے پہلی قانون ساز اسمبلی کی تشکیل کے لیے ووٹ ڈالے تو وہی تحریک یعنی ''النہضہ'' سب سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے والی جماعت تھی۔ النہضہ کے حکومت میں آنے کی وجہ سے تبدیلی کے رخ پر ایک نئی بحث چھڑ گئی۔ اس بحث کا سب سے اہم موضوع سماجی اور سیاسی زندگی میں خواتین کا کردار تھا۔ النہضہ کے نزدیک خواتین مردوں کے لیے ''باعث سکون'' ہیں، جب کہ سیکولر لابی خواتین کے لیے آئین میں اس طرح کی اصلاحات کے استعمال کو صنفی امتیاز سمجھتی تھیں۔ ناقدین بالآخر غالب آ گئے۔ لیکن آئین سازی کے اس عمل نے تیونس کے معاشرے میں موجود تقسیم کو عیاں کر دیا۔

۲۰۱۱ء کے انتخابات میں النہضہ کی کامیابی نے اُسے دو نسبتاً چھوٹی سیکولر جماعتوں کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کی اجازت دے دی۔ جس سے عرب بہار کے بعد ملک میں ہونے والی افراتفری میں بظاہر خاصی کمی آ گئی۔ لیکن حقیقت میں صورت حال عدم استحکام کا ہی شکار تھی۔ سیکولر جماعتیں النہضہ کے برسر اقتدار آنے سے اتنا ہی خوف کا شکار تھیں جتنا کہ ان کو آمریت کے لوٹ آنے کا خوف تھا۔ ۲۰۱۳ء میں النہضہ حکومت سے لاحق خوف کی فضا نے ملک کو بحران کی جانب دھکیل دیا۔ اسی سال فروری کے مہینے میں اسلامی انتہا پسندوں نے حزب اختلاف کے معروف رہنما Chokri Belaid کو قتل کر دیا۔ اس قتل سے احتجاج کی لہر چل پڑی اور لوگوں نے حکومت کو انتہا پسندوں کی پشت پناہی کا ذمہ دار قرار دے دیا۔ تیونس کی جنرل لیبر یونین نے ۱۹۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ جس سے پورا ملک کئی دن متاثر رہا۔ چند ماہ بعد بائیں بازو کے ایک اور رہنما محمد براہیمی کو قتل کیا گیا تو ملک مظاہروں کی لپیٹ میں آ گیا، اور مظاہرین دستور ساز اسمبلی کے تحلیل ہونے کا مطالبہ کرنے لگے۔

۲۰۱۳ء کے یہ ہنگامے با آسانی ملک کو تبدیلی کے اس راستے سے ہٹا سکتے تھے، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ملک کی چار بڑی غیر سرکاری تنظیمیں، جن میں بار ایسوسی ایشن، سول سوسائٹی کی تنظیم اور انسانی حقوق کی سب سے بڑی تنظیم اور لیبر یونین آپس میں مذاکرات کے لیے تیار ہو گئے۔ اگرچہ یہ قومی مذاکراتی کمیٹی میں شامل لوگ ایک دوسرے سے بالکل مختلف نقطہ نظر کے حامل تھے لیکن اس کے باوجود وہ مستقبل کے لائحہ عمل پر متفق ہو گئے۔ انھوں نے نئے انتخابی قوانین، نئے وزیر اعظم اور کابینہ کا مطالبہ رکھا اور آئین کو تسلیم کرنے پر رضامند ہو گئے۔ اس کے بعد اسی کمیٹی نے بڑی سیاسی جماعتوں کے مابین مذاکرات کا آغاز کروایا۔ مذاکرات کے ذریعے النہضہ حکومت چھوڑنے پر رضامند ہو گئی اور نئی ''ٹیکنوکریٹ'' حکومت نے ملک سنبھال لیا۔ اس مذاکراتی کمیٹی نے آئین سازی میں اختلافات کو بھی ختم کروایا، جس کے نتیجے میں جنوری ۲۰۱۴ء میں تقریباً متفقہ طور پر نئے آئین کے متن کو منظور کر لیا گیا۔

ایسا آخری مرتبہ نہیں ہوا کہ اتحادیوں نے مل کر انقلاب کے بعد کی غیر یقینی صورتحال کو ٹھیک کرنے کی کامیاب کوشش کی ہو۔ ۲۰۱۴ء کے آخر میں ملک میں پہلی مرتبہ پارلیمانی اور صدارتی انتخابات کا انعقاد کیا گیا۔ اگرچہ انتخابات تو شفاف ہوئے لیکن ووٹ ڈالنے کا تناسب امیدوں کے برخلاف کافی کم رہا۔ انتخابات کے نتائج سے یہ لگ رہا تھا کہ ملک ایک نئے بحران کی جانب بڑھ رہا ہے۔ صدارتی امیدواروں میں سے جس امیدوار نے سب سے زیادہ ووٹ حاصل کیے وہ السبسی تھے، جو کہ عرب بہار سے پہلے کی حکومت کا حصہ رہے تھے اور بنیادی طور پر بائیں بازو کی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور یہ النہضہ کے مخالف پلیٹ فارم سے منتخب ہوئے تھے۔ ان کی جماعت ''ندا تونس'' بنیادی طور پر بائیں بازو کی جماعتوں کا اتحاد تھا جو کہ اسلامی تحریک النہضہ کی مخالف تمام جماعتوں کو اکٹھے کر کے تشکیل دیا گیا تھا۔

السبسی کو سیکولر اور اسلام پسند دونوں ہی نے قبول کیا، اسی لیے السبسی نے انتخابات کے بعد حیرت انگیز طور پر النہضہ کے ساتھ اتحادی حکومت بنا ڈالی۔ تھوڑے عرصے بعد یہ بات منظر عام پر آئی کہ السبسی نے النہضہ کے رہنما راشد الغنوشی سے ملاقات بھی کی تھی اور یہ اہم پیش رفت تھی۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ السبسی اس حکومت کے وزیر خارجہ رہے ہیں جس نے راشد الغنوشی کو نہ صرف جیل میں ڈالا تھا بلکہ ان کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا تھا۔ اس ملاقات کا عوام پر بہت اچھا تاثر پڑا۔ ان کو یہ پیغام ملا کہ تلخ سیاسی دشمنیوں کا دور اپنے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔ اب جمہوری تیونس ہر قسم کے راہنماؤں کو قبول کر سکتا ہے چاہے وہ سیکولر ہوں، لبرل ہوں یا اسلامسٹ۔

تاہم پُرتشدد انتہا پسندی ملک کی ترقی کی راہ میں اب بھی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ ۲۰۱۵ء کے اوائل میں دہشت گردوں نے نیشنل میوزیم پر حملہ کیا، پھر ساحلی مقام سوسہ پر حملہ کیا گیا، جس میں ۶۰ افراد ہلاک ہوئے جن میں بیشتر یورپی سیاح تھے۔ ان حملوں سے ملک کی سیاحت کی صنعت کو شدید جھٹکا لگا، یہ صنعت ملک کی مجموعی پیداوار کا ۸ فیصد ہے۔ ان حملوں سے تیونس میں انتہا پسندی کے مسئلے کی شدت کا بھی اندازہ ہوا۔ تبدیلی کے ان ابتدائی برسوں میں افراتفری کی وجہ سے حکومت کے لیے مشکل تھا کہ ملک پسماندہ علاقوں سے عسکریت پسندوں کی بھرتی روک سکے۔ ملک میں جمہوریت تو پنپ رہی تھی لیکن اس کے مثبت ثمرات عوام تک نہیں پہنچ پا رہے تھے، یعنی کہ نہ ہی معیشت بہتر ہو رہی تھی اور نہ ہی بے روزگاری میں کمی واقع ہو رہی تھی۔ اس لیے نوجوانوں کے پاس کھونے کو کچھ نہ تھا اور یہی وجہ تھی ان کی عسکریت پسند تنظیموں میں بھرتی ہونے کی راہ ہموار ہو رہی تھی۔ ۲۰۱۵ء تک تیونس عرب میں واحد جمہوری ملک تھا اور اس کے ساتھ ساتھ داعش کے لیے عراق اور شام جانے والے نوجوانوں میں سب سے بڑی تعداد بھی تیونس کی ہی تھی۔ بدقسمتی یہ کہ تیونس اور لیبیا کے درمیان ''بورس'' بارڈر ہے اور لیبیا میں اس وقت خانہ جنگی کی وجہ سے داعش پھل پھول رہی تھی۔ تیونس کے شہری با آسانی لیبیا کی سرحد پار کرتے تھے اور وہاں عسکری تربیت حاصل کر کے واپس اپنے ملک میں آ کر دہشت گردی کے واقعات میں حصہ لیتے تھے۔ اب بھی بہت سے دہشت گرد تیونس اور الجیریا کی سرحد پر واقع پہاڑی علاقوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں اور وہاں سے وہ تیونس کی فوج پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ تاہم یورپی ممالک کی مدد سے اب تیونس نے انسداد دہشت گردی کے شعبے میں اپنی صلاحیتوں میں بے پناہ اضافہ کیا، لیکن خطے کے واحد جمہوری ملک ہونے کے ناطے اس پر سب کی نظریں ہیں۔ گزشتہ برس گرمیوں میں القاعدہ اور داعش دونوں نے اپنے جنگجوؤں سے تیونس پر نظر رکھنے کو کہا تھا۔

اگرچہ غیر ملکی امداد کی وجہ سے ملک کے بہت سے شعبوں میں بہتری آئی، جن میں انسداد دہشت گردی بھی شامل ہے۔ لیکن امداد دینے والے ممالک اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ تبدیلی کی لہر اندرون ملک سے ہی آ سکتی ہے۔

۲۰۱۱ء سے پہلے امریکا اور تیونس میں کوئی قابل ذکر تعلقات نہ تھے۔ جب باراک اوباما نے اقتدار سنبھالا تو انہوں نے مسلمان ممالک کے ساتھ نئے سرے سے تعلقات کی خواہش ظاہر کی اور ساتھ یہ بھی واضح کیا کہ وہ عرب ممالک پر جمہوریت مسلط کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ لیکن جب جمہوری تحریکوں نے آمریت کے نظام کا خاتمہ کیا تو ان تحریکوں کے آغاز پر تو باراک اوباما نے ان کی حمایت ہی کی۔ امریکا نے مظاہرین کی نہ صرف بیانات کی حد تک حمایت کی بلکہ ان کو مالی

معاونت بھی دی۔ اس وقت امریکا کی سیکرٹری ہیلری کلنٹن نے تیونس میں بن علی کی حکومت کے خاتمے کے دو ماہ کے اندر ہی تیونس کا دورہ کیا اور اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ اس کے ساتھ ہی امریکا کی تیونس کو دی جانے والی امداد میں بھی اضافہ ہوا۔ یہ امداد ۲۰۰۹ء میں ایک کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر تھی، جو کہ ۲۰۱۱ء میں بڑھ کر دو کروڑ ۶۰ لاکھ ڈالر کر دی گئی۔ اس کے علاوہ دوسرے امدادی پروگرامات کے ذریعے بھی تیونس کی امداد ایک اعشاریہ چار ارب ڈالر تک پہنچ گئی (ٹرمپ نے اس امداد کو کم کرنے کی کافی کوشش کی لیکن کانگریس کی حمایت کی وجہ سے یہ امداد اب بھی جاری ہے)۔ عرب بہار کے بعد سے یورپی ممالک نے بھی اپنی امداد میں اضافہ کیا ہے، ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۷ء تک ۲/اعشاریہ ۶۵ ارب ڈالر دیے جا چکے ہیں۔

اس مدد کے باوجود تیونس کو اب بھی کئی رکاوٹوں کا سامنا ہے۔ نوجوانوں میں بے روزگاری کی شرح ۳۰ فیصد کے قریب قریب ہے اور مہنگائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ عرب بہار کے بعد سے خود کشی کی شرح تقریباً دگنی ہو چکی ہے اور ایک لاکھ کے قریب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہنرمند نوجوان ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ حالیہ دنوں میں سمندر کے راستے اٹلی کی طرف ہجرت کرنے والوں میں تیونس نے ایریٹیریا کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ اس رجحان کو کم کرنے اور ملک کے معاشی حالات میں بہتری لانے کے لیے حکومت کو کچھ غیر مقبول فیصلے کرنے ہوں گے، جیسا کہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں کمی۔ اس طرح کے اقدامات کے لیے طاقتور مزدور یونین سے مقابلہ کرنا ہوگا، خاص طور پر UGTT جیسی مزدور تنظیم سے جو ماضی میں بھی ملکی سطح کی کامیاب ہڑتالیں کر چکی ہے۔ لیکن اگر اس طرح کے اقدامات نہیں کیے جاتے تو عالمی امدادی ملک بھی نہ صرف منہ موڑ لیں گے بلکہ نوجوانوں کے ملک چھوڑنے کے رجحان میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا اور عسکریت پسندوں کی بھرتی بھی بڑھتی چلی جائے گی۔

روایتی سرکاری اداروں کی اصلاح بھی ایک بڑا کام ہے، جو کہ حکومت کو کرنا ہے۔ عدالتی نظام میں ابھی تک کوئی اصلاح نہیں کی گئی ہے۔ پرانے قوانین نئے آئین سے ٹکراتے ہیں، بہت سے جج بھی ''بن علی'' دور کے ہیں۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ملک میں اس وقت کوئی بھی آئینی عدالت موجود نہیں ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ارکان پارلیمان کا اس عہدے کے لیے کسی جج کے نام پر اتفاق نہیں ہو سکا ہے۔ جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والی پہلی حکومت ۲۰۱۴ء سے اکتوبر ۲۰۱۹ء تک قائم رہی، لیکن قانون سازی کے عمل میں ارکان کی غیر حاضری کی وجہ سے اسے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

اس وقت سب سے اہم کام عوام کا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ انٹرنیشنل ری پبلکن انسٹی ٹیوٹ کے حالیہ سروے کے مطابق ۲۰۱۹ء کے آغاز تک ۳۴ فیصد لوگ صدر پر اعتماد کرتے تھے اور ۳۲ فیصد تیونسی عوام نے پارلیمان پر اعتماد کا اظہار کیا۔ جہاں تک بات اپنے غصے کے اظہار کی ہے تو اکثریت خاص کر نوجوان بیلٹ باکس کے بجائے سڑکوں پر آنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہر سال تقریباً ۹۰۰۰ مظاہرے ہو رہے ہیں، جن میں اکثر ان ہی پسماندہ علاقوں میں ہوتے ہیں جہاں سے ''عرب بہار'' کا آغاز ہوا تھا۔ اس مسئلے کا حل آسان نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اختیارات کو نچلی سطح پر منتقل کیا جائے۔ مئی ۲۰۱۸ء میں ہونے والے بلدیاتی انتخابات اس صحیح سمت میں پہلا قدم تھا۔ ان بلدیاتی انتخابات میں ۴۷ فیصد نشستیں جیت کر عالمی سطح پر صنفی امتیاز کے خاتمے کا ثبوت دیا گیا اور دوسری اہم بات یہ کہ ان انتخابات کے ذریعے نوجوانوں کو بھی نمائندگی ملی، جیتنے والے ۳۷ فیصد امیدواروں کی عمریں ۳۵ سال سے کم تھیں۔

ڈوبتی ہوئی کشتی کی تعمیر

تیونسی عوام نے بہت جلد اس بات کا اندازہ لگا لیا ہے کہ ان کا ملک ایسا نمونہ پیش نہیں کر سکتا، جو کسی دوسرے ملک میں آزمایا جا سکے۔ لیکن ان کے تجربات سے یہ ضرور سیکھا جا سکتا ہے کہ جمہوریت کی حمایت کیسے کی جائے۔ دوسرے ممالک کے لیے پہلا سبق تو یہ ہے کہ انہیں اپنے معاملات سے دور رکھا جائے۔ تیونس کی خوش قسمتی ہے کہ انھوں نے غیر ملکیوں کے جمہوری ایجنڈوں کو آگے بڑھانے کے بجائے نچلی سطح سے خود ہی تبدیلی کے عمل کا آغاز کیا اور پھر بعد کے مراحل میں دیگر ممالک نے اس تبدیلی کی حمایت کی۔ اس کے مثبت نتائج یہ سامنے آئے کہ آمر ملک میں ہونے والے مظاہروں پر کسی غیر ملکی سازش کا الزام نہ لگا سکے۔ امریکا اور یورپ کو چاہیے کہ جہاں بھی تبدیلی کی لہر اٹھے وہاں اس وقت تک مداخلت نہ کی جائے، جب تک کہ وہ مکمل طور پر قدم نہ جما لے۔ جب تبدیلی کا عمل مکمل ہو جائے تو عالمی ممالک کو ایسے ملک کی مالی تزویراتی حمایت کرنی چاہیے تاکہ وہاں آنے والی تبدیلی کے مثبت نتائج سامنے آئیں۔

ایسے ممالک جہاں جمہوریت نئی ہو، ان کے لیے تیونس کی اتفاق رائے کی سیاست کے نمونے سے سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔ تیونس میں بھی جمہوری تبدیلی کا یہ سفر ۲۰۱۳ء میں ہی رک جاتا اگر راشد الغنوشی اور السبسی دونوں رہنما سیاسی مفادات کو ملکی مفادات پر قربان نہ کرتے۔ عموماً ابھرتے ہوئے رہنما ذاتی مفادات کے فروغ کے لیے آمرانہ طرز عمل اختیار کرتے ہیں اور طاقت اور اختیارات کو اپنے پاس رکھنے پر ہی ترجیح دیتے ہیں۔ جمہوری تبدیلی کے سفر کے آغاز میں رہنماؤں کو چاہیے کہ سیاست میں ایک دوسرے کو جگہ دیں اور ذاتی مفادات کے بجائے ملکی اور عوامی مفادات کو مقدم رکھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب جمہوریت مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے تو سیاسی مقابلہ بازی کے لیے کافی وقت اور مواقع مل جاتے ہیں۔

اسی طرح جمہوریت کی طرف پلٹنے والے ممالک کو تیونس کی قانون ساز اسمبلی کی مثال کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ آمریت کے خاتمے کے بعد جب نئی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو تین سال تک تو حکومت بغیر کسی آئین کے ہی کام کرتی رہی اور آج جب آئین سازی کے عمل کو مکمل ہوئے چھ برس گزر چکے، ابھی تک اس قانون کے بیشتر حصے پر عملدرآمد نہیں ہو سکا ہے۔ بہت سی باڈیز کا قیام ابھی تک عمل میں نہیں لایا جا سکا جیسا کہ آئینی عدالت۔ تیونس جمہوریت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو بچانے کی کوششوں میں مصروف ہے، لیکن اس عمل کے دوران عوام مایوسی اور الجھنوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ تبدیلی کے عمل سے گزرنے والے ممالک کو چاہیے کہ اس سارے عمل کے دوران آنے والے مراحل سے کس طرح سے نمٹنا ہے، اس کا لائحہ عمل پہلے سے ہی طے کر لیں اور اداروں کے قیام کے حقیقی اہداف کا تعین کریں اور ان اہداف کو ہر صورت حاصل کرنے کی کوشش کریں تاکہ جمہوریت نہ صرف مضبوط ہو سکے بلکہ نتائج بھی دے سکے۔

تاہم تیونس کے اس عمل میں سب کچھ ایسا نہیں ہے، جس کی نقل کی جا سکے۔ جبکہ معاشی اور سیاسی اصلاحات کی ترتیب اور رفتار ایسی نہیں ہے کہ اس کی مثال پیش کی جا سکے۔ تیونس کے رہنماؤں نے پہلے سیاسی تجدید، نئے آئین کے مسودے کی تیاری، انتخابات کے انعقاد اور سیاسی اداروں کی تشکیل نو کے عمل کو ترجیح دی۔ لیکن اس دوران تباہ ہوتی معیشت اور معاشرے کے اندر پڑنے والے شگاف پر وہ توجہ مرکوز نہ رکھ سکے۔ بہت سے تیونسی یہ سمجھتے ہیں کہ ۲۰۱۰ء میں انھوں نے جس وقار کا مطالبہ کیا تھا، یہ جمہوری حکومت انھیں وہ وقار اور عزت دینے میں ناکام رہی۔ جس کی وجہ سے عوام جمہوری

باقی صفحہ نمبر ۱۲

روس: امریکا اور ایران تنازع کا واحد فاتح

Strobe Talbott and Maggie Tennis

اس سے پہلے کہ ایران امریکا کے فوجیوں پر میزائل حملہ کرتا، روس کے صدر پیوٹن نے شام کے ہم منصب کے ساتھ ملاقات کی، جس میں امریکا اور ایران کے درمیان بڑھتے ہوئے تنازع پر گفتگو کی۔ روس نے امریکی فضائی حملے اور اس میں قاسم سلیمانی کی ہلاکت کی بار بار مذمت کی ہے، عالمی سطح پر اس وقت روس اپنے حق میں بہتر ہوتی صورتحال کا انتظار کر رہا ہے۔

امریکا اور تہران کے درمیان تعلقات شام میں شروع ہونے والی جنگ کے بعد سے خراب ہیں۔ یہ اس وقت مزید خراب ہوئے جب امریکا نے ایٹمی معاہدے کو منسوخ کیا، جب کہ روس اور ایران کے تعلقات اس وقت سے مضبوط ہیں، جب سے شام میں یہ ایک دوسرے کے ساتھ فوجی تعاون کر رہے ہیں۔ ماسکو کا شام میں بڑھتا ہوا اثر و رسوخ یہ بتاتا ہے کہ امریکا اور ایران میں بڑھتی ہوئی کشیدگی خطے میں روس کی پوزیشن کو مستحکم کرے گی یا کم از کم اتنا تو ہوگا کہ روس امریکا کی ایک ڈراؤنی تصویر دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ عالمی رہنما اور امریکا کے اتحادی واشنگٹن کے ساتھ تعاون پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

روس نے بشارالاسد کا کنٹرول شام میں برقرار رکھنے میں مدد کی ہے، جب کہ امریکا اور نیٹو اتحادی مسلسل اسد حکومت کو ختم کرنے کے در پے رہے ہیں۔ امریکا شام سے بظاہر نکل گیا ہے لیکن اسد حکومت اور روس کا کنٹرول شام میں باقی ہے۔ روس اسد حکومت کی مدد کر رہا ہے اور اس کی مدد سے ہی امریکا کو کمزور کرنے اور مشرق وسطیٰ میں اپنا اثر قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ چار برسوں کے دوران روس شام کی جنگ میں اپنی حیثیت منوانے میں کامیاب رہا ہے، ساتھ ساتھ اس نے ترکی کو بھی نیٹو اتحاد سے دور رکھا ہوا ہے، روس نے عالمی دنیا میں اپنی شہرت میں اضافہ کیا ہے۔ دنیا میں روس کی پہچان ’کنگ میکر‘ کے طور پر ہونے لگی ہے اور یہ سب کچھ امریکا کو نیچا دکھانے کی قیمت پر کیا جا رہا ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی کے نامناسب فیصلے، جیسے شام میں کرد شراکت داروں سے علیحدگی نے طاقت کا جو خلا پیدا کیا اسے روس کی موجودگی نے بھر دیا، جمعہ کی ہڑتالوں سمیت ٹرمپ انتظامیہ کے ہر نامناسب اقدام نے شام میں اور عالمی منظرنامے نے روس کی پوزیشن کو مستحکم کیا ہے۔ عراقی حکومت بھی عراق میں امریکی دہشت گردی پر نالاں ہے۔ عراقی وزیراعظم نے امریکی فوجیوں کی عراق میں موجودگی کے معاہدے کی خلاف ورزی پر ہڑتال کی کال دی ہے۔ بہت جلد عراق امریکی فوجیوں کے انخلا کو یقینی بنائے گا، شام میں امریکا کی موجودگی مشکل ہے یہی سارے حالات خطے میں روس کی پوزیشن کو مستحکم کر رہے ہیں۔

روس کی پوزیشن مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ سلیمانی پر حملے نے امریکا کی پوزیشن اس کے اتحادیوں کے سامنے کمزور کی ہے، اور پوری دنیا میں امریکا کو سخت گیر ملک کی حیثیت سے دیکھا جا رہا ہے، مشرق وسطیٰ کے اتحادی ممالک میں بھی امریکا کی پوزیشن کمزور رکھنے میں روس نے کامیابی حاصل کر لی ہے اس کی بہترین مثال ترکی ہے، جو کہ اکتوبر میں امریکا کے ساتھ معاہدہ میں شامل تھا۔ ترکی اور امریکا اس معاہدے کے تحت مل کر شام میں آپریشن کر رہے تھے لیکن سلیمانی کی ہلاکت کے بعد ترکی نے امریکا مخالف بیان میں کہا ہے کہ وہ خطے میں بیرونی مداخلت، قتل و غارت گری اور فرقہ وارانہ تنازعات کو پسند نہیں کرتا ہے۔

اگر امریکا مزید حملے کرے گا تو امریکا اور یورپی اتحادیوں کے درمیان فاصلے بڑھیں گے اور اس کا فائدہ بھی روس کو ہوگا۔ امریکا کی مشرق وسطیٰ کے لیے طے کردہ حکمت عملی سے اس کے اتحادی خوش نہیں ہیں، خصوصاً جس طرح وہ ایٹمی معاہدے سے باہر آیا ہے۔ رپورٹ یہ بتاتی ہیں کہ امریکا نے سلیمانی پر حملہ کرتے وقت برطانیہ یا اپنے دوسرے اتحادیوں کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ اگر امریکا اپنے اتحادیوں کو متوجہ نہیں کر سکا تو وہ عالمی منظرنامے پر خود کو تنہا کر لے گا۔

واشنگٹن اپنی حیثیت یورپ کے سامنے اس وقت مزید گرا لے گا، جب ایران سلیمانی کی ہلاکت کا بدلہ لینے کے لیے اپنا ایٹمی پروگرام دوبارہ شروع کر دے۔ ایٹمی سرگرمیوں کے حوالے سے ایران نے متنبہ کیا کہ وہ کسی بھی قسم کی پابندی برداشت نہیں کرے گا، روس نے نہ صرف ایٹمی معاہدے کی منسوخی اور ایران پر اس حوالے سے دباؤ ڈالنے پر امریکا کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ بلکہ روس اس وقت ٹھیک اسی طرح امریکا سے اختلاف کر رہا ہے جیسے یورپی ممالک جرمنی اور فرانس کر رہے ہیں۔ روس امریکا کو اس بات کا ذمہ دار قرار دے رہا ہے کہ امریکا کی وجہ سے ہی ایران نیوکلیئر پاور بننے جا رہا ہے۔

یہاں پر یہ بھی حقیقت ہے کہ امریکا ایران تنازع میں روس مشکلات کا شکار بھی ہوسکتا ہے، شام کی جنگ میں روس کے لیے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں خاص طور پر جب اسرائیل ایران کے حمایتی گروپ حزب اللہ پر حملے شروع کر دے۔ حزب اللہ نے ایرانی کمانڈر سلیمانی کی ہلاکت کا بدلہ لینے کا عہد کیا ہے۔ دوسری صورت میں ایران اگر ایٹمی پروگرام شروع کرتا ہے تو خطے میں عدم استحکام پیدا ہوگا اور روس شام میں اپنا کنٹرول کھو دے گا۔ اگر روس ایران سے بہت اچھے تعلقات بنا لے گا تو اسے مشرق وسطیٰ میں موجود اپنے اتحادیوں کی جانب سے شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑے گا۔

کچھ عرصے پہلے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ٹرمپ اپنے وعدے کی پاسداری کرتے ہوئے امریکی فوج کو مشرق وسطیٰ سے نکال لے گا، لیکن اب یہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ ملک کو کسی اور ہی دلدل کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ یہ کہنا قبل از وقت ہوگا کہ یہ دلدل مواخذے کی کارروائی سے بنتی ہے یا ایران کے ساتھ دوبارہ مذاکرات کرنے پڑتے ہیں۔

دوسری جانب روس نے مشرق وسطیٰ میں امریکا کے جارحانہ رویے کی وجہ سے اپنی پوزیشن مستحکم کر لی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ امریکا ایران جنگ ہو یا نہ ہو، ایران پر لگائی گئی پابندی روس کو فائدہ پہنچائے گی۔ امریکا عالمی منظرنامے میں اپنی حیثیت کھو دے گا اور مقابلے کی دوڑ سے باہر ہوگا یا پھر ایران پر امریکی پابندی عالمی دنیا خصوصاً مشرق وسطیٰ کو امریکا کے خلاف کر دے گی۔ مستقبل کے حالات کیسے رہیں گے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، لیکن اس وقت ماسکو خطے میں موجود تمام ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات بنا رہا ہے اور شام میں بھی اس کی فوجیں موجود ہیں روس مشرق وسطیٰ میں اپنا اثر قائم کرتے ہوئے امریکا کا متبادل بن رہا ہے۔

(مترجم: سمیہ اختر)

"The only winner of the US-Iran showdown is Russia". ("brookings.edu". January 9, 2020)

جنوب مشرقی ایشیا میں چین کا بڑھتا اثر و رسوخ

شمالی لاؤس کے ایک دور افتادہ حصے میں بانس کا جنگل کرینوں کو راہ دے رہا ہے۔ جنگل میں ایک شہر بسایا جارہا ہے۔ ریسٹورنٹس، مساج پارلر اور دوسری بہت سی تعمیرات کی جارہی ہیں۔ لاؤس، میانمار اور تھائی لینڈ کے سنگم پر واقع ہونے کی بنیاد پر اس علاقے کو گولڈن ٹرائنگل اسپیشل اکنامک زون کہا جارہا ہے۔ اس علاقے کو جدید ترین انداز کا دکھانے کے لیے یہاں شاندار ہوٹل بھی ہیں، بھرپور چمک دمک والے جوئے خانے بھی ہیں۔ اسی بنیاد پر اسے ''لاؤس ویگاس'' بھی کہا جارہا ہے، تاہم لاؤس کے عام شہریوں کا اس علاقے سے کوئی تعلق نہیں۔ جنگل میں آباد کیے جانے والے اس شہر میں چینی کرنسی یوآن چلتی ہے یا تھائی لینڈ کی بھات۔ لاؤس کی کرنسی یہاں قبول ہی نہیں کی جاتی۔ سڑکوں پر سائن بورڈ اور دکانوں پر بورڈ بھی چینی زبان میں ہیں یا پھر انگریزی میں۔ شہر کی گھڑیاں بھی چین کے معیاری وقت کے مطابق سیٹ کی گئی ہیں یعنی لاؤس کے مقامی وقت سے ایک گھنٹہ آگے ہیں۔

ایک عشرے کے دوران چین جنوب مشرقی ایشیا میں سرمایہ کاری کے حوالے سے سب سے آگے رہا ہے۔ ۲۰۱۸ء میں لاؤس میں کی جانے والی ۸۰ فیصد بیرونی سرمایہ کاری چین کی ہے۔ میانمار کے شہر منڈالے سے بھی اچھا خاصا سرمایہ آرہا ہے۔ اس شہر میں چینی بہت بڑی تعداد میں آباد ہیں اور معاشی طور پر بہت مضبوط ہیں۔ بیشتر بیرونی سرمایہ کاری اسپیشل اکنامک زون میں کی جارہی ہے تاکہ پرمٹ، ٹیکس، ڈیوٹی اور دیگر معاملات میں دی جانے والی غیر معمولی ترغیبات سے بھرپور استفادہ کیا جاسکے۔

ملک سے باہر سرمایہ کاری کے حوالے سے چین کے بڑے کاروباری اداروں کو مزید تحریک دینے کی فی الحال ضرورت نہیں۔ چینی حکومت نے کم و بیش ڈیڑھ عشرے کے دوران بڑے کاروباری اداروں کو ملک سے باہر بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی تحریک دی۔ اس کے نتیجے میں بہت سے علاقائی اور دور افتادہ ممالک میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی راہ ہموار ہوئی۔ متعدد خطوں کو بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے جوڑنے کے منصوبے ''بیلٹ اینڈ روڈ انشیٹیو'' کے شروع کیے جانے کے بعد چینیوں کی بیرون ملک سرمایہ کاری کا دائرہ مزید وسیع ہوگیا ہے۔ امریکی تھنک ٹینک اسٹمسن سینٹر کے ماہر برائن آئلر کہتے ہیں ''ریلوے، ہائی وے اور پائپ لائنز کے ساتھ ساتھ اب چینی کاروباری طبقہ متعدد ممالک کے اسپیشل اکنامک زون میں بھی خطیر سرمایہ کاری کررہا ہے۔ یہ سب کچھ چین کی معاشی توسیع کے منصوبے کا حصہ ہے''۔

معاملات پر نظر رکھنے والے ادارے ''لینڈ واچ تھائی'' نے بتایا ہے کہ بیلٹ اینڈ روڈ کے بینر تلے ۱۹۰ سے زائد چینی کاروباری اداروں نے لاؤس میں کم و بیش ڈیڑھ ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے۔ ۲۰۱۶ء اور ۲۰۱۸ء کی درمیانی مدت میں چینی اداروں نے کمبوڈیا کی سرحد پر واقع شہر سنہانوک والے سے جڑے ہوئے اسپیشل اکنامک زون میں مجموعی طور پر ایک ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کی۔

چینی سرمایہ جہاں بھی جاتا ہے، چینی محنت کش بھی وہیں کا رخ کرتے ہیں۔ ۱۹۸۳ء میں میانمار کے شہر منڈالے میں چینی مقامی آبادی کا ایک فیصد تھے۔ آج یہ تناسب ۳۰ تا ۵۰ فیصد ہے۔ اسپیشل اکنامک زون کے نزدیک چینیوں کی تعداد میں زیادہ تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ۲۰۱۹ء میں متعلقہ صوبے کے گورنر نے روزنامہ ''اسٹریٹ ٹائمز'' کو بتایا کہ صرف دو سال میں سنہانوک والے میں چینی باشندے مقامی آبادی کے ایک تہائی کے مساوی ہوچکے ہیں۔ چینی باشندوں کی تعداد بڑھنے کے ساتھ ساتھ معاشی معاملات پر ان کی گرفت بھی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ۲۰۱۷ء کے ایک مارکیٹ سروے کے مطابق میانمار کے شہر منڈالے میں چینی نسل کے باشندے ۸۰ فیصد ہوٹلوں، ۷۰ فیصد سے زائد ریستوران اور ۴۵ فیصد سے زائد جیولری شاپس کے مالک ہیں۔

چینی تارکین وطن کی بڑھتی ہوئی تعداد نے خطے میں چین کے خلاف جذبات بھڑکانے میں بھی مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ جنوبی ایشیا کی بے بس حکومتیں صرف اس امید پر چینی سرمایہ کاری کا ہر حال میں خیر مقدم کرتی ہیں کہ ایسا کرنے سے اُن کی معیشت بحالی کی راہ پر گامزن ہوسکے گی۔ بعض معاملات میں چینی سرمایہ کاری خاصی بارآور بھی ثابت ہوئی ہے۔ لاؤس میں بیرونی سرمایہ کاری نے شرح نمو کو بلند کرکے خام قومی پیداوار بڑھانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ایک عشرے کے دوران لاؤس میں شرح نمو ۷ء۷ فیصد رہی ہے۔

تھائی لینڈ کے دارالحکومت بنکاک میں قائم تھنک ٹینک ''فوکس آن گلوبل ساؤتھ'' نے ۲۰۱۷ء میں اسپیشل اکنامک زون سے متعلق ایک مطالعہ میں بتایا کہ کمبوڈیا اور میانمار میں قوانین اور طرزِ حکمرانی نے بیرونی سرمایہ کاروں کا ساتھ دیا ہے۔ مقامی باشندوں کی حق تلفی ہوئی ہے اور ماحول کو بھی شدید نقصان پہنچا ہے۔ ایشیائی ترقیاتی بینک کے الفریڈو پرڈ یگوئیرو اس نکتے سے اتفاق کرتے ہیں کہ لاؤس، کمبوڈیا اور میانمار میں اسپیشل اکنامک زون سے پیدا ہونے والے غیر معمولی فوائد پوری معیشت پر محیط نہیں رہے۔ اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ چینی کاروباری ادارے مقامی لوگوں کو بھرتی نہیں کرتے۔ ۲۰۱۸ء تک لاؤس کے شہری ملک کے ۱۱ اسپیشل اکنامک زون میں صرف ۳۴ فیصد ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے تھے، جبکہ حکومت نے وعدہ کیا تھا کہ ان خصوصی علاقوں میں مقامی باشندوں کو ۹۰ فیصد تک ملازمتیں مل سکیں گی۔ چینی اداروں کا کہنا ہے کہ مقامی کاریگروں میں مطلوبہ مہارت نہیں پائی جاتی۔ میانمار میں سول سوسائٹی گروپس نے اس کے جواب میں چین کے تعاون سے قائم کیے جانے والے اسپیشل اکنامک زون اور بندرگاہ کیاکپیو (Kyaukpyu) کا حوالہ دیا ہے، جس کے نزدیک ٹیکنیکل کالج ہے مگر اس کالج سے سیکھ کر نکلنے والوں کو ملازمت نہیں دی جاتی۔

دوسرے بہت سے معاملات میں بھی مقامی لوگوں کو مشکلات اور محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سنہانوک والے میں قائم گارمنٹ فیکٹریاں کپڑا، بٹن اور دھاگا درآمد کرتی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے اسپیشل اکنامک زون کا دورہ کرنے والے چینی باشندے اور ورکر چینیوں کی ملکیت والے ریسٹورنٹس اور دکانوں کی سرپرستی کرتے ہیں اور علی پے جیسی چینی ایپس کے ذریعے ادائیگی کرکے اشیا و خدمات پر سیلز ٹیکس بھی بچاتے ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا پر چین کے بڑھتے ہوئے معاشی اثر و رسوخ کے موضوع پر آنے والی کتاب کے مصنف سیمیسٹین اسٹرینگیو کہتے ہیں ''حقیقت یہ ہے کہ زر چین کی سرزمین چھوڑتا ہی نہیں''۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ مقامی یا میزبان حکومتوں کے لیے فائدہ بہت کم ہے۔ ۲۰۱۷ء میں لاؤس کے قومی خزانے کو اسپیشل اکنامک زون سے صرف ۲ کروڑ ڈالر ملے، جو اس کی مجموعی آمدن کا صرف ایک فیصد ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کے غریب ممالک میں یہ بات عام ہے کہ اسپیشل اکنامک زون کے قیام کے حوالے سے مقامی باشندوں سے مشاورت کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔ گولڈن

باقی صفحہ نمبر ۱۲

چینی زبان میں روڈ سائن، استنبول میں ہنگامہ

کچھ مدت قبل ترکی کے شہر استنبول میں شہریوں کو کچھ ایسا دیکھنے کو ملا جو اُن کی آنکھوں کے لیے بہت حد تک اجنبی تھا۔ شہر کے بعض حصوں میں (بالخصوص اُن علاقوں میں جو سیاحوں میں بہت مقبول ہیں) میٹرو اور ٹرام اسٹیشنوں کے نام چینی حروفِ تہجی میں دکھائی دیے۔ چین کے صوبے سنکیانگ میں اوغور ترک مسلمانوں سے بدسلوکی اور حق تلفی پر مشتعل مظاہرین نے بعض سائن بورڈ توڑ بھی دیے۔ بعض سائن بورڈوں پر چین مردہ باد اور مشرقی ترکستان کی آزادی سے متعلق نعروں پر مبنی پوسٹر چسپاں کردیے گئے۔ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے میئر اکرم اماموغلو نے بتایا کہ یہ سائن بورڈ استنبول اور چینی سفارت خانے کے درمیان سمجھوتے کے نتیجے میں لگائے گئے تھے، اور جتنی تیزی سے لگائے گئے تھے اُتنی ہی تیزی سے ہٹا بھی دیے گئے۔

ترکی میں چین کی موجودگی بڑھ رہی ہے۔ بہت سی چیزوں اور معاملات پر غور کرنے سے محسوس کیا جاسکتا ہے کہ چین اب ترکی میں بھی قدم جما رہا ہے۔ ایک عشرے قبل ترکی آنے والے چینی سیاحوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ اور اب یہ تعداد چار لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ چین نے ترکی کو ہائی اسپیڈ ٹرین کے لیے ٹریک بنانے میں غیر معمولی حد تک مدد دی ہے۔ چینی کمپنی ہواوے ترکی میں فائیو جی موبائل نیٹ ورک پھیلانے پر کام کر رہی ہے۔ چینی سرمایہ کار ترک کانوں سے سنگِ مرمر نکلوا کر وطن بھجوا رہے ہیں۔ گزشتہ برس چین کے مرکزی بینک نے ایک معاہدے کے تحت ترکی کو ایک ارب ڈالر فراہم کیے تاکہ ترک کرنسی کو مضبوط کیا جاسکے۔ سُننے میں آرہا ہے کہ ترکی میں بہت جلد چین سے بڑے پیمانے پر سرمایہ آئے گا۔ یہ سرمایہ دی بیلٹ اینڈ روڈ منصوبے کے تحت ہوگا، جس کا بنیادی مقصد چین کو درجنوں ممالک سے جوڑ کر ایک بڑی تجارتی راہداری قائم کرنا ہے۔ چین اِن تمام ممالک میں بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کے لیے غیر معمولی حد تک کوشاں ہے۔ پاکستان میں چین پاک اقتصادی راہداری (سی پیک) منصوبہ بھی اِسی سلسلے کی کڑی ہے۔

چین نے ترکی کے بارے میں جو کچھ سوچ رکھا ہے، اُس پر اب تک عمل ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔ اس کا تعلق سنکیانگ کی صورتِ حال سے بھی ہے۔ چین کے اِس صوبے میں اوغور (ترک) نسل کے مسلمانوں سے بدسلوکی نے ترکی میں بہت سوں کو ناراض کر رکھا ہے۔ گزشتہ برس بڑے مسلم ممالک میں ترکی شاید واحد ملک تھا، جس نے سنکیانگ میں کم و بیش دس لاکھ افراد کو داڑھی رکھنے اور راسخ العقیدہ مسلم کی طرز پر جینے کی پاداش میں جیل میں ڈالے جانے کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ اس احتجاج کی بنیاد پر چین نے ترکی کے ایک بڑے ساحلی شہر ازمیر میں اپنا قونصلیٹ بند کردیا تھا۔ شنگھائی یونیورسٹی میں سینٹر فار ترکش اسٹڈیز کے گو چینگ گینگ کہتے ہیں، بات یہ ہے کہ ترکی نے چین کی طرف سے کھینچی جانے والی سرخ لکیر پار کی تھی۔ تب سے اب تک ترکی نے غیر معمولی احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے۔ گزشتہ جون میں ترک پارلیمان میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے ارکان نے سنکیانگ کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے حوالے سے تحقیقات کا مطالبہ کیا تھا۔ حکمراں جماعت نے اکثریتی رائے سے اس مطالبے کو مسترد کردیا۔ چین کے اپنے دورے میں ترک صدر رجب طیب اردوان نے سنکیانگ کے حراستی مراکز کے حوالے سے خاصے نرم انداز سے گفتگو کی۔

چین کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ترکی سے زیادہ دیر دور نہیں رہے گا۔ ترکی کم و بیش آٹھ کروڑ افراد پر مشتمل مارکیٹ ہی نہیں، یورپ اور مشرقِ وسطیٰ میں داخلے کا راستہ بھی تو ہے۔ خانہ جنگی سے تباہ ہونے والے شام کی تعمیرِ نو کے حوالے سے بے تاب چینی کنٹریکٹر آسان اور سستی رسائی کے لیے ترکی سے بہتر تعلقات پر زور دے سکتے ہیں۔ استنبول کی کوک یونیورسٹی کے اتیلے اتلی کہتے ہیں کہ ترکی کے پاس وسائل بھی ہیں اور سپلائر بھی اس لیے چینیوں کو ترکی کا رخ کرنا ہی پڑے گا۔

چند برسوں کے دوران ترکی نے غیر ملکی سرمایہ کاروں کی توجہ پانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس کا ایک بنیادی سبب تو یہ ہے کہ امریکا اور یورپ سے اس کے تعلقات خاصے کشیدہ رہے ہیں۔ اس کا ایک بنیادی سبب روس سے دوستی بڑھانا اور روسی میزائل خریدنا بھی ہے اور پھر بنیادی حقوق کی خلاف ورزیوں کا معاملہ بھی ہے۔ حکومت سے تعلق رکھنے والی بہت سی شخصیات نے صدر رجب طیب ایردوان پر زور دیا ہے کہ روس کی طرح چین سے بھی دوستی بڑھائی جائے اور اشتراکِ عمل کی بنیاد مزید مضبوط کی جائے۔ خیر، اس بات کا امکان تو کم ہی ہے کہ چینی قیادت ترکی کی معیشت کی بہتری کے لیے کوئی بیل آؤٹ پیکیج فراہم کرے گی۔ ۲۰۰۲ء اور ۲۰۱۸ء کے دوران ترکی میں کی جانے والی بیرونی سرمایہ کاری کا ۸۰ فیصد یورپ سے تھا اور چین کا حصہ محض ایک فیصد تھا۔

استنبول میں تفریح گاہوں اور شاپنگ سینٹر والے مرکزی علاقے سے جڑے ہوئے سٹے تعمیر شدہ بیجنگ ہوٹل میں چینی سیاح بڑی تعداد میں قیام پذیر رہتے ہیں۔ جیکی چینگ کم و بیش بیس سال قبل ترکی آئے تھے۔ انہوں نے ٹیکسٹائل کی مصنوعات اور سوویٹرز کے شعبے میں قسمت آزمائی کی اور کامیاب رہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ترکی میں کاروبار کا معاملہ بہت اچھا ہے۔ وہ استنبول کے علاوہ ترکی کے دیگر شہروں میں بھی اپنا کاروبار پھیلانا چاہتے ہیں۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا ایسا کرنے سے ان کے آبائی ملک یعنی چین سے مزید سیاحوں کی آمد ہوگی اور سرمایہ کار بھی آئیں گے تو انہوں نے کہا کہ ترک حکومت طویل مدت قیام کا ویزا اور کاروبار کا اجازت نامہ دینے کے معاملے میں غیر معمولی حد تک معاون رہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت جس چیز کی ہے، وہ ہے چینی زبان میں سائن بورڈ۔ ترکی کے طول و عرض میں چینی زبان میں سائن بورڈ دکھائی دیں گے تو چینی سیاح اور سرمایہ کار زیادہ اپنائیت محسوس کریں گے۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Why Chinese road signs cause outrage in Istanbul". ("The Economist". January 30, 2020)

بقیہ: بھارت جنگ چھیڑنے کے دہانے پر ہے!

گردانتے رہیں گے؟ اس حوالے سے مائیکل کگلمین کہتے ہیں ''افغانستان میں حقیقی اور دیرپا امن کے قیام کے بعد پاکستان کا کیا ہوگا، یہ بات بہت اہم ہے۔ اس سے بڑھ کر ایک سوال یہ ہے کہ کیا امریکی پالیسی ساز پاکستان کو افغانستان سے ہٹ کر بھی اہم گردانیں گے اور اُسے اہمیت دی جاتی رہے گی''۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"India could provoke war with Pakistan in 2020: US foreign affairs expert".
("The Express Tribune". February 9, 2020)

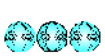

امریکیوں کی ''معصومیت'' رخصت ہوئی

ابوصباحت

دنیا کی نصف سے زائد آبادی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں مرتکز ہے۔ یہ لوگ دن بدن امریکا سے بعید تر ہوتے جارہے ہیں۔ ایشیا اور مشرق وسطیٰ کے بیشتر افراد کے لیے امریکا اقتصادی جنت ہے مگر ساتھ ہی ساتھ انہیں اس ملک سے ڈر بھی بہت لگتا ہے۔ دن رات امریکا کے بارے میں خدشات پالنا ان کا بہترین مشغلہ ہے۔ بہت سوں کو تو صحیح ڈھنگ سے نیند ہی اس وقت آتی ہے، جب وہ امریکا کو دو چار گالیاں دے چکتے ہیں! ایسا کیوں ہے؟ ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں امریکا سے نفرت کیوں بڑھتی جارہی ہے؟ امریکی پالیسیوں کو ان خطوں میں ہمیشہ شک کی نگاہ سے کیوں دیکھا جاتا ہے؟

کشور محبوبانی نے اپنی کتاب ''بی یونڈ دی ایج آف انوسینس'' میں اس امر پر بحث کی ہے کہ دنیا بھر میں امریکا سے جو نفرت پائی جاتی ہے، اس کا بنیادی سبب خود امریکی پالیسیوں کا استحصال پسند ہونا ہے۔ امریکا جو کچھ ہوا کرتا تھا، اب نہیں رہا۔ اس کی حیثیت اور نوعیت بدل گئی ہے۔ امریکا کے بانیوں نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا تھا، جس میں مساوات اور شخصی آزادی ہو۔ ان کے جانشینوں نے ان بنیادی آئیڈیلز کو نظر انداز کرکے دنیا پر حکومت کرنے کے بارے میں سوچا اور اس سوچ پر خاصے بھونڈے انداز سے عمل کیا۔ امریکا اپنے ابتدائی دور میں مظلوم اور محکوم اقوام کے لیے امید کی کرن تھا۔ اس نے ایک ایسی دنیا کا تصور دیا، جس میں مساوات ہوگی اور لوگ ایک دوسرے کا احترام کریں گے۔ دنیا بھر کے لوگ امریکا میں آباد ہوئے اور ایک نئی زندگی کی ابتدا کی۔ یہ دنیا کی بھی نئی ابتدا تھی۔

سنگاپور سے تعلق رکھنے والے کشور محبوبانی کا شمار عصر حاضر کے بڑے سفارت کاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے کیریئر ڈپلومیٹ کی حیثیت سے زندگی گزاری ہے اور اب علمی میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ مغربی اور ایشیائی جرائد میں ان کی تجزیاتی تحریریں شائع ہوئیں تو برطانوی ہفت روزہ ''دی اکانومسٹ'' نے انہیں ایشیا کا ٹوئن بی قرار دیا۔ ٹوئن بی نے تاریخ کے میدان میں اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھائی ہیں اور کشور محبوبانی نے بھی گزرے ہوئے زمانوں کا جائزہ لے کر آنے والے زمانوں کی بات کی ہے۔ ان کا خاص موضوع امریکا ہے، جو دنیا بھر میں تبدیلیوں کا بنیادی سبب ہے۔ کشور محبوبانی امریکا کو ایک ایسے تناظر میں دیکھتے ہیں، جسے بیشتر تجزیہ کاروں اور تجزیہ نگاروں نے نظر انداز کر رکھا ہے۔ کشور محبوبانی نے امریکا کو قریب سے دیکھا ہے۔ امریکی معاشرے کی خوبیاں اور خامیاں ان کے سامنے بے نقاب ہیں۔ سنگاپور کے مستقل مندوب کی حیثیت سے انہوں نے اقوام متحدہ میں بارہ سال گزارے ہیں۔ اس دوران انہوں نے امریکا کو موضوع کی حیثیت سے دیکھا، پرکھا اور برتا ہے۔ امریکا اور باقی دنیا کے درمیان تعلق کا تجزیہ انہوں نے خوب کیا ہے۔ دو عشروں کے دوران بین الاقوامی سیاست میں رونما ہونے والی تبدیلیوں پر ان کی خوب نظر ہے۔

''بی یونڈ دی ایج آف انوسینس'' میں کشور محبوبانی نے ہمیں اس امریکا کا دیدار کرایا ہے، جو ایشیا اور دیگر خطوں کے لوگوں کی نظر میں بسا ہوا ہے۔ امریکا کو صرف گالیاں دینے والوں سے اختلاف کرتے ہوئے کشور محبوبانی نے لکھا ہے کہ امریکا وہ ملک ہے، جس نے دنیا کا نظام مکمل طور پر بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس ملک نے اربوں انسانوں کو پرامید رہنا سکھایا ہے۔ امریکا نے علوم اور فنون کی سطح پر پیش رفت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ شخصی آزادی پر بھی غیر معمولی زور دیا ہے۔ امریکا نے دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر ایسا عالمی نظام ترتیب دیا، جس کی بدولت کئی اقوام کو بہتر ڈھنگ سے پنپنے کا موقع ملا۔ مگر سرد جنگ کے خاتمے پر اس ملک نے راستہ بدل لیا۔ اب تک وہ ایک خصوصی ملک تھا، اب اس نے عام ملک کا روپ دھار لیا۔ اس نے دوسروں کی پریشانیوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ اس کے فیصلوں سے کئی ممالک بلکہ خطوں پر عجیب و غریب اثرات مرتب ہو رہے تھے مگر اس نے ان اثرات کے بارے میں سوچنا ترک کردیا۔ امریکی پالیسی سازوں نے صرف اپنے قومی مفادات کو ہر حال میں ترجیح دینا شروع کی۔ چین اور اسلامی دنیا کو یکسر نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنائی گئی۔ افغانستان اور عراق میں جو کچھ ہوا اس نے اخلاقی اقدار کے حوالے سے امریکا کی ساکھ مزید خراب کردی۔ گوانتاناموبے جیل کے واقعات نے امریکا کو اہل جہاں کی نظر میں مزید گرادیا۔

کشور محبوبانی کا استدلال ہے کہ امریکا اور باقی دنیا کے درمیان خلیج پاٹنے کی کوشش نہ کی گئی تو امریکا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ امریکا کے پاس اب بھی وقت ہے کہ راستہ بدل لے اور باقی دنیا کو اپنے ساتھ ملا کر چلے۔ ایشیا اور مشرق وسطیٰ کی رائے عامہ تبدیل کرنے کے لیے امریکا کو مفاد پرستی پر مبنی اقدامات سے گریز کرنا ہوگا اور ان خطوں کی ترقی کی راہ میں مزاحم ہونے سے بھی باز رہنا ہوگا۔ کتاب سے اقتباسات پیش خدمت ہیں:

---

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد ''نیوز ویک'' کے ایڈیٹر فرید زکریا نے ''وہ ہم سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟'' کے عنوان سے ایک کور اسٹوری لکھی۔ یہ کور اسٹوری پڑھ کر بیشتر امریکیوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ انہیں بلاجواز نشانہ بنایا جارہا ہے۔ نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر میں ہلاک ہونے والے امریکیوں کو بے قصور گردانا گیا اور ان پر حملہ کرنے والوں کی شدید مذمت کی گئی۔ بیشتر امریکیوں کو اپنی بے گناہی کا تو یقین تھا، مگر اس بات سے وہ حیران بنے ہوئے تھے کہ دنیا بھر میں لوگ یہ سوال کر رہے ہیں کہ امریکی ان سے کیوں نفرت کرتے ہیں!

امریکا کا سب سے بڑا تضاد یا المیہ یہ ہے کہ اس کے شہری دنیا بھر میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور معلومات حاصل کرنے کے ذرائع تک ان کی رسائی بھی قابل رشک ہے، مگر اس کے باوجود عالمی سیاست کے بارے میں ان کی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بیشتر امریکیوں کو بظاہر اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنی حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں زیادہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ امریکی حکومت کے اقدامات سے دنیا بھر میں خرابیاں بھی پیدا ہو رہی ہیں، مگر اس حقیقت کو بیشتر امریکیوں نے نظر انداز کر رکھا ہے۔

میں نے اپنی اس کتاب کے ذریعے امریکیوں کو اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا بھر میں پونے تین ارب انسان رات دن ان پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی کے ہر معاملے پر امریکی پالیسیاں اثر انداز ہوتی ہیں۔ امریکی حکومت جو کچھ کرتی ہے اور امریکی کارپوریٹ ادارے جو گل کھلاتے ہیں، ان سے امریکا کے خلاف نفرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس رجحان پر قابو پانے کے لیے خود امریکی عوام کو مرکزی کردار ادا کرنا ہوگا اور اپنی حکومت کو باور

کرانا ہوگا کہ قومی مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے نام پر اس کے ہر اقدام کو درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ''روشوم'' ایک ایسی مووی تھی جس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ایک ہی معاملے کو کتنے زاویوں سے دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ ہر قوم اور ہر نسل کے لوگوں کو اپنے اپنے کلچر اور جغرافیائی خواص کے ساتھ زندہ رہنے کا حق ہے۔ یہ ان کا پیدائشی حق ہے جو چھینا نہیں جاسکتا۔ امریکیوں اور امریکی حکومت کو یہ بات سمجھنا ہوگی۔ دوسروں کو احترام دیے بغیر ان سے احترام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ امریکی تجزیہ نگار چند اصطلاحات کی مدد سے عالمی حالات کا تجزیہ کرنے کے عادی ہیں۔ دوسروں کی زبان اور ان کے پس منظر سے انہیں کچھ خاص غرض نہیں۔ امریکی دانشوروں کو یہ بات سمجھنا ہوگی کہ دوسروں کا نقطۂ نظر بھی اہم ہوتا ہے۔ غیر امریکی تناظر کی بھی اہمیت ہے۔ اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیے بغیر معاملات کے درست ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ دوسروں کی توقعات بھی اہم ہیں۔ ان کی بات سنے بغیر کوئی فیصلہ کرنا درست نہیں۔ امریکا چاہے تو اپنی پالیسیاں تبدیل کرکے ایک بار پھر ساکھ بحال کرسکتا ہے۔ وہ واحد سپر پاور ہے اس لیے اس کی طاقت بھی غیر معمولی ہے۔ اس غیر معمولی طاقت کو مثبت کاموں پر صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کا دل جیتنے کے لیے ان کی بات ماننا ہوگی، ان کا نقطۂ نظر سمجھنا ہوگا۔ ایسا کیے بغیر امریکا اپنے دشمنوں کی تعداد میں اضافے کا عمل روک نہیں سکتا۔ امریکا کے بانیوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک ایسا ملک قائم کر رہے ہیں جو دوسروں کی رائے کا احترام کرے گا۔ اب وقت آگیا ہے کہ امریکی عوام اور حکومت اپنے بانی قائدین کی بات پر عمل کریں۔

اسلام اور مغرب

اسلام کے حوالے سے مغرب کی پالیسیوں میں استحکام کا پایا جانا امر محال ہے۔ خود مغربی دانشور بھی اب اس بات کو واضح طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں بگاڑ پیدا کرکے خود کو الگ کرلینا ایک صدی سے بھی زائد عرصے سے مغربی دنیا کا وتیرہ رہا ہے۔ اہل دانش اس بات پر زور دیتے آرہے ہیں کہ اسلامی دنیا کو نظر انداز کرنے کی پالیسی ترک کرکے امریکا اور یورپ کو اب اسلامی ممالک کی حالت بہتر بنانے پر توجہ دینا چاہیے۔ ایسا نہ کیا گیا تو ایک نیا بلاک معرض وجود میں آسکتا ہے، جو مغرب کی قائدانہ حیثیت کو چیلنج کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔

اسلامی دنیا کو مسلسل نظر انداز کرکے مغرب بھیانک غلطی کر رہا ہے۔ متعدد اسلامی ممالک میں امریکا اور یورپ نے مل کر خرابیاں پیدا کی ہیں اور اب ان سے یکسر لاتعلقی اختیار کرلی ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے، جسے کسی بھی طور قبول اور برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی ممالک کے حوالے سے امریکا اور یورپ کی کوئی ایسی مربوط پالیسی رو بہ عمل نہیں جسے بنیاد بناکر کہا جاسکے کہ اسلامی دنیا کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے میں مدد دی جارہی ہے۔ اسلامی دنیا میں مغرب نے صرف اپنے دشمن پیدا کیے ہیں۔ مغربی دنیا کی زبردست مادّی ترقی سے متاثر ہوکر اسلامی دنیا سے کروڑوں افراد مغربی ممالک میں کام کر رہے ہیں اور بس بھی گئے ہیں، مگر انہوں نے مغرب کو اس کی روح کے ساتھ قبول نہیں کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مغرب میں بسے ہوئے مسلمانوں میں مغربی حکومتوں اور تہذیب سے نفرت میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ بلا جواز نہیں۔ مغرب نے جو بویا تھا وہی کاٹ رہا ہے۔

امریکا اور یورپ کی ترجیحات میں اسلامی دنیا کی مدد کرنا اب بھی شامل نہیں۔ یہ دونوں مل کر اسلامی ممالک کو پس ماندہ رکھنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کی حکومتوں کو عدم استحکام سے دوچار کیے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو مجبور کر رہے ہیں کہ انتہا پسندی کو واحد آپشن کی حیثیت سے قبول کرلیا جائے۔ اسلامی دنیا میں زیادہ سے زیادہ عدم استحکام پیدا کرنا بظاہر مغربی پالیسیوں کا مرکزی نکتہ ہے۔ امریکا اور یورپ اس حقیقت سے کسی طور انکار نہیں کرسکتے کہ انہوں نے سو سال کے عرصے میں تیل کی دولت سے مالا مال اسلامی ممالک کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں پوری اسلامی دنیا کو اپنا دشمن بنالیا ہے۔

اسلامی دنیا سے ڈیلنگ کے معاملے میں امریکا اور یورپ کی پالیسیوں میں جو تضاد اور کنفیوژن پایا جاتا ہے، اس سے نمٹنے میں اکیسویں صدی کا بڑا حصہ ضائع ہوگا۔ مغرب کی بنیادی غلطی یہ تصور ہے کہ جدید دنیا میں اس کے مفادات کو اسی وقت تحفظ حاصل ہوگا جب اسلامی ممالک شدید غربت کی چکّی میں پستے رہیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سیاسی عدم استحکام کی راہ اپنائی گئی ہے۔

مغرب کی دوسری بھیانک غلطی نے پہلی غلطی کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور ممکنہ طور پر یہ لاشعوری عمل کا نتیجہ ہے۔ مغرب نے جدید علوم اور فنون میں اپنی مہارت سے اسلامی دنیا کو بہتر ڈھنگ سے مستفید نہیں کیا۔ اس کے نتیجے میں علمی سطح پر اسلامی ممالک پیچھے رہ گئے ہیں۔ اسلامی دنیا کو جدیدیت سے ہم آہنگ کرنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں گیا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکا نے یورپ کو دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے مارشل پلان تیار کیا۔ ایسا ہی پلان جاپان کے لیے بھی تیار کیا گیا۔ جنگ سے تباہ حال جاپان کو معاشی اور علمی اعتبار سے نئی زندگی دی گئی۔ اسلامی دنیا کے معاملے میں امریکا نے ایسا کیوں نہیں کیا، اس کا سبب ایک بڑی علمی بحث کے ذریعے طے کیا جاسکتا ہے۔ جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لیے اسلامی دنیا کو امریکا اور یورپ سے علوم اور فنون کے معاملے میں غیر معمولی مدد درکار تھی، مگر اس کا اہتمام کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں گیا۔ کیا یہ اسٹریٹجک غلطی تھی یا سوچ لیا گیا کہ اسلامی ممالک کو پسماندگی سے دوچار رکھنا بہتر ہے؟ اس کا جواب مغربی اور اسلامی دنیا کے مؤرخین ہی بہتر طور دے سکیں گے۔

اسلامی دنیا کے حوالے سے مغرب کی تیسری بڑی اسٹریٹجک غلطی یہ ہے کہ اعتدال پسند عناصر کی بروقت حوصلہ افزائی نہیں کی گئی، اور جن لوگوں نے اعتدال پسندی کی راہ اپنائی ان پر شک ہی کیا جاتا رہا۔ اسلامی ممالک میں جن اعتدال پسند عناصر نے سیاسی میدان میں کامیابی حاصل کی ان کی نیت پر شک کیا گیا اور انہیں عدم استحکام سے دوچار کرنے کی شعوری کوشش کی گئی۔ کئی مسلم ممالک میں اعتدال پسند سیاسی جماعتوں نے حکومت بنائی تو مغربی دنیا ان کے پیچھے پڑگئی۔ مغربی دنیا سے تعلق رکھنے والے بہت سے مسلم نوجوان اسلامی دنیا کی پسماندگی دیکھ کر الجھن میں مبتلا ہیں، مگر پورے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی معاشروں کی زبوں حالی پر کڑھنے والے ان مسلم نوجوانوں کا ہیرو اسامہ بن لادن نہیں۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اسلامی معاشرے سیاسی اور معاشی اعتبار سے مغرب کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں اور اپنی مذہبی اقدار اور تہذیبی روایات بھی برقرار رکھیں۔ اسلامی دنیا کے اعتدال پسند عناصر کی یہ سوچ کسی بھی اعتبار سے ناقابل قبول نہیں۔ مسلم دنیا کے اعتدال پسند طبقات اپنی تہذیب اور علمی قوت کا احیا چاہتے ہیں۔ اس معاملے میں انہیں مغرب سے مدد درکار رہے۔ یہ لوگ مغرب کے بہترین شراکت دار ثابت ہوسکتے ہیں۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ ان کی بات سننا مغرب کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ چند عشروں کے دوران مغرب نے ان لوگوں کی مدد کی ہے جو اسلامی دنیا میں اعتدال پسند طبقات کو کچلنے میں مصروف ہیں!

مغرب کی چوتھی بڑی اسٹریٹجک غلطی یہ ہے کہ اس نے اسلامی دنیا میں جدید سیکولر تعلیم کے فروغ پر توجہ نہیں دی۔ جدید طریق تعلیم کے تحت تیار کیے جانے والے معاشرے اپنے دور کے تمام تقاضوں کو نبھانے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ مغرب نے ایک طرف تو اسلامی معاشروں میں جدید سیکولر تعلیم کو فروغ نہیں دیا اور دوسری طرف ان اسلامی مدارس کو ملنے والے فنڈ سے چشم پوشی برتی جو ہر معاملے میں غیر معمولی شدت پسندی سکھا رہے تھے۔ شدت پسندی سکھانے والے مدارس سے مکالمے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ انہیں مرکزی دھارے سے الگ کر دیا گیا۔ کسی بھی معاشرے میں شدت پسندی پر مائل ذہن کو اعتدال کی راہ پر لانا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ اور اس مقصد کے حصول میں عشرے بھی صرف ہو جاتے ہیں۔

اسلامی دنیا کے حوالے سے مغرب کی پانچویں بڑی اسٹریٹجک غلطی یہ ہے کہ مغربی سیاسی قائدین نے محض اپنے قلیل المیعاد فائدے کے لیے اسلامی دنیا میں طویل المیعاد فوائد کو نظر انداز کیا۔ اور یوں اسلامی دنیا میں ایسی سیاسی تبدیلیاں لائی گئیں، جو مغرب کے چند قائدین کے لیے تھیں۔ مغربی ممالک میں انتخابات کے زمانے میں اسلامی دنیا سے خوفزدہ کر کے ووٹ حاصل کیے جاتے ہیں۔ یورپ میں یہ تصور عام کر دیا گیا ہے کہ اسلامی دنیا پس ماندہ رہے تو اچھا ہے، ترقی یافتہ اسلامی دنیا اس کے لیے سب سے بڑے خطرے کی شکل میں سامنے آئے گی۔

نائن الیون کے بعد پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکا کا بھرپور ساتھ دیا۔ جنرل پرویز مشرف کو اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے امریکا سے بھرپور مدد درکار تھی۔ انہوں نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاکستان کے بھرپور کردار کے عوض قومی سطح کے چند فوائد طلب کیے۔ وہ چاہتے تھے کہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ اقتصادی امداد ملے۔ انہوں نے ٹیکسٹائل کو نے میں اضافے کی درخواست کی۔ امریکی صدر جارج واکر بش نے شمالی کیرولائنا کے چند ٹیکسٹائل ووٹروں کو ناراض کرنے سے گریز کیا اور قومی مفاد کو داؤ پر لگا دیا۔ یہ معاملہ صدر اور ری پبلکن پارٹی کے لیے ووٹوں کا تھا۔

یورپ کا معاملہ خاصا مختلف ہے۔ جدیدیت سے اسلامی دنیا کو دور رکھنے میں یورپ نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مگر جغرافیائی اعتبار سے یورپ اس قابل نہیں کہ اسلامی دنیا سے براہ راست زیادہ دیر متصادم رہ سکے۔ امریکا بہت دور واقع ہے۔ یورپ اور شمالی افریقا کو صرف بحیرۂ روم الگ کرتا ہے۔ یہ چھوٹا سا سمندر مسلمانوں کی راہ میں مزاحم نہیں ہو سکتا۔ شمالی افریقا سے ہر سال لاکھوں غیر قانونی تارکین وطن یورپ میں داخل ہوتے ہیں۔ یورپی حکومتوں کے لیے ان سے نمٹنا بڑا مسئلہ ہے۔ یورپ اس معاملے میں بدحواسی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس کے بجائے اسے اسلامی دنیا کو ترقی سے ہمکنار کرنے کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور پسماندہ اسلامی ممالک کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے میں مدد دینا چاہیے تاکہ وہ ہر معاملے میں یورپ کا رخ کرنے کے بارے میں سوچنا کم کر دیں۔ یورپ نے جو غیر معمولی ترقی کی ہے اس میں اسلامی دنیا کے قدرتی وسائل کی بندر بانٹ کا بھی اہم کردار ہے۔ اس حوالے سے اسلامی ممالک میں یورپ کے لیے نفرت کا پایا جانا ذرا بھی حیرت انگیز نہیں۔ یہ دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کہ یورپ نے اسلامی دنیا کو جدید علوم اور فنون سے دور رکھنے کے سلسلے میں کوئی باضابطہ فیصلہ کیا ہوگا۔ بعض غلط فہمیوں کے نتیجے میں معاملات اور تعلقات بگڑتے چلے جاتے ہیں۔ اسلامی دنیا اور یورپ کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ یورپی باشندوں کے ذہنوں میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ اسلامی دنیا ان کی ترقی سے خائف ہے اور اس ترقی کے ثمرات کو مٹانا چاہتی ہے۔ جب تک یہ تاثر زائل نہیں ہوگا تب تک یورپ کے لوگ اسلامی دنیا کو مکمل طور پر نہیں اپنائیں گے۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران اسلامی ممالک کی سیاسی، معاشی اور علمی ناکامی پر یورپ کی جانب سے کبھی مسرت کا اظہار نہیں کیا گیا۔ یورپ نے بیسویں صدی میں بے مثال ترقی کی اور دوسری طرف اس کی سابق مسلم نوآبادیاں مشکلات سے دوچار ہوتی چلی گئیں، مگر اس ناکامی پر یورپ نے کبھی فخر کا اظہار نہیں کیا۔ اس نوعیت کا اظہار شائستگی کے اصولوں کے منافی ہے۔ مگر یورپ کے لیے پالیسیاں تیار کرنے والوں نے یہ ضرور طے کر لیا تھا کہ اسلامی ممالک کو پس ماندہ رکھنے ہی میں یورپ کی بہتری ہے۔ اب ثابت ہو چکا ہے کہ ان کی سوچ سراسر غلط تھی۔

اسلامی ممالک کو پس ماندگی کے دائرے سے نکال کر جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا ناگزیر ہے۔ اس معاملے میں امریکا اور یورپ کو مرکزی کردار ادا کرنا ہے۔ جب تک یہ اہم کام نہیں کیا جائے گا، سیاسی اور علمی سطح پر خرابیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔

میں نے گزشتہ بائیس سال میں سے گیارہ سال امریکا میں گزارے ہیں۔ اس دوران بہت سے امریکیوں سے میری دوستی ہوئی ہے اور میں ان تک وہ رائے پہنچانے میں کامیاب ہوا ہوں جو میں نے امریکا کے بارے میں قائم کی ہے۔ بہت سے امریکیوں کو اس بات کا احساس ہے کہ باقی دنیا سے ان کے ملک کا تعلق تیزی سے بگڑ رہا ہے، مگر وہ اس تبدیلی کے بنیادی اسباب نہیں جانتے۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ نائن الیون کے بعد دنیا نے امریکا کو نفرت کی نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ امریکا سے نفرت بہت پہلے سے کی جارہی ہے اور اس کے اسباب بھی پہلے سے موجود تھے۔

میں ایشیائی ہوں۔ سنگاپور کے ایک ہندو گھرانے میں میرا جنم ہوا۔ میرے پڑوس میں مسلمان بھی رہتے تھے اور چینی بھی۔ ہندو، مسلمان اور چینی مل کر دنیا کی آبادی کا نصف سے زیادہ ہیں۔ اور میں نے امریکا میں بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ اس کا مجھے دہرا فائدہ پہنچا ہے۔ اب میں امریکیوں اور ایشیائیوں کی رائے بہتر طور پر جانتا ہوں۔ میں بتا سکتا ہوں کہ خرابی کہاں کہاں ہے۔ امریکی انتظامیہ دنیا کو سمجھنے اور برتنے کے معاملے میں کوتاہ نظری کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ باقی دنیا کو نظر انداز کر کے امریکا فلاح نہیں پا سکتا۔ اسے فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

اقوام متحدہ میں سنگاپور کے مستقل مندوب کی حیثیت سے پوسٹنگ کے دوران مجھے امریکا کے طول و عرض میں سفر کا موقع ملا، میں نے مختلف شہروں میں خطاب کیا۔ اس طور مجھے اندازہ ہوا کہ میں امریکا کو کسی حد تک سمجھنے میں کامیاب رہا ہوں۔ امریکی معاشرہ اتنا قابل مذمت نہیں، جتنا دنیا اسے سمجھتی ہے۔ امریکی حکومت کا معاملہ مختلف ہے۔ پالیسی تیار کرنے والوں نے ملک کے مستقبل کے بارے میں سوچنا شاید ترک کر دیا ہے۔ میں امریکی معاشرے کو جانتا ہوں اور اس کی بیشتر خوبیوں اور خامیوں پر نظر ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ امریکی عوام خود اپنے حکمراں طبقے کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جو کچھ بھی خارجہ پالیسی کے محاذ پر کیا جارہا ہے، وہ امریکی عوام سے پوچھ کر نہیں کیا جارہا۔ میں چاہوں گا کہ امریکی عوام کا نقطۂ نظر بھی سمجھا جائے اور دوسری طرف امریکیوں کو بھی یہ بات سمجھنا ہوگی کہ ان کی حکومت کے فیصلے پوری دنیا پر اثر انداز ہو رہے ہیں۔

باقی صفحہ نمبر ۱۲

بھارتی مسلمانوں کے ووٹ کی حقیقت

بلال احمد

یہ مقالہ نئی دلی میں قائم تحقیقی ادارے سینٹر فار دی اسٹڈی آف ڈیولپمنٹ کے ایسوسی ایٹ پروفیسر بلال احمد نے اگست ۲۰۱۹ء میں بھارتی انتخابات سے متعلق ایک سیمینار How India Voted میں پڑھا۔ مقالہ نگار نے اس مقالے میں بھارتی مسلمانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ اب بھارت میں مسلمان ووٹ اپنی حیثیت کھو چکا ہے اور مسلمان اپنے ووٹ کو نظریاتی حیثیت سے منوانے کے قابل نہیں رہے ہیں۔

بھارت میں ۲۰۱۹ء کے انتخابات کے بعد کیا مسلمانوں کا ووٹ اہمیت رکھتا ہے؟ اس پیچیدہ سوال کا جواب دو مختلف طریقوں سے دیا جاتا ہے۔ اول یہ کہ سیاسی مبصرین کا ایک طبقہ لوک سبھا میں مسلمان ارکان پارلیمان کی کم ہوتی تعداد کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ دلیل دیتا ہے کہ پارلیمان میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے، جو اس بات کو واضح کرتی ہے کہ موجودہ بھارت میں مسلمانوں کی سیاسی حیثیت خستہ حالی کا شکار ہے۔ بی جے پی کی جانب سے مسلم امیدواروں کو انتخابی ٹکٹ دینے سے انکار، قومیت کے نام پر ہندوتوا کے نظریے پر مبنی جارحانہ سیاسی مہم کے ذریعے ووٹروں کو متحرک کرنا اور اپوزیشن جماعتوں کی خاموشی اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلم ووٹ اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ انتخابی عمل میں مسلمانوں کی شمولیت کو بالکل مختلف انداز سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور یہ بھی دکھائی دے رہا ہے کہ بی جے پی کی مخالف سیاسی جماعتیں طویل عرصے تک مسلمانوں کو اپنے ووٹ بینک کے طور پر استعمال کرتی رہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی سیاست کی ایسی شکل سامنے آئی جس نے بھارتی مسلمانوں کو متحد ہو کر مرکزی سیاسی دھارے کا حصہ بننے کی اجازت نہیں دی۔ مسلمان کسی خاص رعایت یا برتاؤ کا مطالبہ نہیں کرتے، اسی لیے ان کے ساتھ مخصوص طبقے کے ووٹر جیسا سلوک بھی نہیں کیا جاتا۔ موجودہ دور میں یہ نعرہ ''سب کا ساتھ، سب کا وکاس، سب کا وشواس''، اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ نریندر مودی کی قیادت میں بی جے پی سب انسانوں کو برابر سمجھتی ہے۔ اس وجہ سے مسلمان خود کو ایک ووٹ بینک نہیں سمجھتے اور بی جے پی کی کامیابی کو ہندوتوا نظریے کی کامیابی نہیں سمجھتے۔

مسلمانوں کے ووٹ کی اس متضاد وضاحت کو تکنیکی بنیادوں پر جزوی طور پر تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن بی جے پی کی انسانیت نوازی کا بھرم اس وقت کھل جاتا ہے جب وہ ہندوتوا کے نظریے کے استحکام کے لیے اپنے سیاسی مشن کو مسلم دشمنی پر استوار کرتی ہے۔ علاوہ ازیں بی جے پی کی حریف سیاسی جماعتوں نے ۲۰۱۹ء کے الیکشن کے لیے انتخابی مہم میں مسلمانوں کے تحفظات اور تشویش دور کرنے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ درحقیقت، اپوزیشن جماعتوں، خاص کر کانگریس نے ہندوازم کے ذریعے ہندو ووٹروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے خود کو مسلمانوں سے لاتعلق رکھنے کی کوشش کی۔ یہ دلیل کہ مسلم ووٹ اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے، بظاہر معقول لگتی ہے۔

بی جے پی نے بھی ایک قوم، ایک سیاسی برادری کا نظریہ پیش کرتے ہوئے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ مذہب کے بجائے محض سیکولر سوچ رکھتے ہوئے ووٹ دیں۔ اس حقیقت کو کوئی بھی نظرانداز نہیں کر سکتا کہ بھارتی آئین سیاسی عمل کے مکمل طور پر سیکولر تخیل کی تجویز پیش کرنے والے الگ انتخابی حلقوں سے انکار کرتا ہے۔ ایک قوم، ایک سیاسی برادری کا نظریہ بی جے پی کی موجودہ حیثیت کو درست ثابت کرتا ہے جس کے مطابق بھارتیہ جنتا پارٹی مسلمانوں کو خوش کرنے کی پالیسی پر یقین نہیں رکھتی۔

موجودہ بھارت میں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں سے متعلق واضح بیانیے کو تین بنیادی تصوراتی پیچیدگیوں کا سامنا ہے۔

اول یہ خیال پایا جاتا ہے کہ مسلمان ایک اکائی کی صورت میں موجود ہیں، انتخابی عمل میں ان کا برتاؤ شک و شبے سے بالاتر ہے۔

دوم مسلمانوں کے ووٹ ڈالنے کو ایسی خودمختار مشق سمجھا جاتا ہے کہ مسلم سیاست بس مسلمانوں کے ووٹ ڈالنے تک محدود ہے۔

سوم مسلمانوں کے ووٹ ڈالنے کے انداز کو ہمیشہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق قانون ساز اداروں میں مسلمان سیاست کی نمائندگی ہے۔ درحقیقت، یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمان ووٹر اور مسلم ارکان پارلیمان (ایم پیز اور ایم ایل ایز) کے درمیان تعلق اساسی اور معاونت پر مبنی ہے۔

ان تخیلات پر غیر ناقدانہ انحصار ہمیں اُن عمرانی، ثقافتی اور اقتصادی عناصر پر توجہ مرکوز کرنے کی اجازت نہیں دیتا، جو مختلف طریقوں سے مسلمانوں کے سیاسی تصورات کا تعین کرتا ہے۔ اسی لیے آج کے بھارت میں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیوں کو خودمختار مباحثے کے طور پر دیکھنا چاہیے جو ہندو بالادستی پر مبنی سیاست سے پیدا ہونے والے چیلنجوں کا ہمیشہ جواب نہیں دیتی۔ تجزیاتی مقاصد کے لیے ۲۰۱۹ء کے بعد کے بھارت میں مسلم سیاسی بیانیے کو تین پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے: مسلمانوں کی موجودگی، مسلمانوں کی نمائندگی اور مسلمانوں کی شراکت یا شمولیت۔

مسلمانوں کی موجودگی وہ مقبول تصور ہے، جس سے مراد ایک مذہبی سیاسی برادری لی جا سکتی ہے۔ یہ ''مغل اعظم'' کا ''اکبر'' ہو سکتا ہے یا خان صاحب، ''پکا مسلمان'' کی صورت میں کوئی شخصیت، بھارتی میڈیا مسلمانوں کے تشخص پیش کرنے کے لیے ایسی ہی کوئی خاص ثقافتی مثال پیش کرتا رہتا ہے۔ سیاسی جماعتیں ان خاکوں کو اپنے نظریاتی ڈھانچے میں ڈھال کر پیش کرتی ہیں، جس کا مقصد سیاسی انداز میں اچھے اور بُرے مسلمان میں تمیز کرنا ہے۔ گزشتہ پانچ برس کے دوران اچھے مسلمان اور بُرے مسلمان کا فرق پہلے سے مختلف انداز میں دوبارہ ایجاد کیا گیا ہے۔ اگرچہ اچھے مسلمان کا خاکہ جو ہندوتوا کے نظریے کا حامی قوم پرست ہو، وہ اب بھی باقی ہے لیکن مسلمانوں کا مجموعی تاثر ایسا بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، جو قوم پرستی کے خلاف ہو۔

مسلمانوں کی زندگی کا ہر پہلو مشکوک بنا کر یہ تاثر قائم کیا جا رہا ہے کہ مسلم شناخت نہ حل ہونے والا سیاسی عجوبہ ہے۔ مثال کے طور ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ کسی بھی مسلمان بچے کی پیدائش ہندوؤں کی آبادی کے لیے خطرہ ہے، مسلمان بچے کے لیے مدرسے کی تعلیم کو علیحدگی کی علامت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کے کھانے کی عادات و اطوار کو ہندو مخالف سمجھا جاتا ہے (مسلمان گائے کا گوشت کھاتے ہیں)، مسلمانوں کی ازدواجی زندگی (مسلمانوں میں تین طلاق کے استعمال کے باعث) سماجی برائی کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ کسی مسلمان کی موت بھی قوم پرستی کے خلاف تصور کی جاتی ہے (کیوں کہ مسلمان اپنے قبرستانوں کے لیے قیمتی زمین حاصل کر رہے ہیں)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دقیانوسی سوچ ۲۰۱۴ء کے انتخابات کے بعد رفتہ رفتہ انتخابی مہم کا حصہ بن گئی۔ جیسا کہ، مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی بحث آسام اور مغربی بنگال کی انتخابی سیاست میں واضح طور پر چھائی رہی۔ بھارتی میڈیا نے مسلم مخالف شہریت کے متنازع قانون، (Citizenship amendment bill) اور نیشنل رجسٹر آف سٹیزن (National register of Citizens) پر باضابطہ مباحثے کرائے۔ اسی طرح یوپی میں تین طلاقوں اور مسلمانوں کے قبرستان کی وقف کی حیثیت کو سنجیدہ انتخابی مسائل بنا کر پیش کیا گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بی جے پی ۲۰۱۹ء کے انتخابات سے پہلے ہی مسلمانوں کی موجودگی کو متنازع بنانے کے قابل ہو گئی تھی۔

مسلمانوں کی موجودگی کو منفی انداز میں پیش کر کے یقینی طور پر ہندو بالادستی کی کوششوں کو مدد فراہم کی گئی۔ کئی تحقیقی مقالوں

سے یہ بات واضح ہے کہ ۲۰۱۴ء کے بعد کے بھارت میں ہندو سیاسی شناخت کو مستحکم کرنا فیصلہ کن عنصر کے طور پر ابھرا۔ لیکن ہندو بالادستی کی ان کوششوں پر مسلمانوں کا مجموعی ردعمل سامنے نہیں آیا۔ لو جہاد (Love Jihad) مسلمان لڑکے کی ہندو لڑکی سے محبت کی شادی، گھر واپسی، رام مندر کی تعمیر ہو یا تین طلاقوں پر پابندی کا معاملہ، کسی بھی مسئلے نے مسلمانوں کو اس بات پر نہیں ابھارا کہ وہ بی جے پی کے ہندوتوا پر مبنی بیانیے کا براہ راست جواب دے سکیں۔ مسلمانوں کی اس (اسٹریٹجک) تزویراتی ناکامی نے ہندوتوا نظریہ پھیلانے والے گروہوں کو اس بات پر اکسایا کہ وہ گاؤ ماتا کے تحفظ کی جارحانہ سیاست پر توجہ مرکوز کریں، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کے خلاف پرتشدد واقعات کی نئی قسم سامنے آئی، یعنی ہجوم کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل۔ مسلم کش فسادات کے مقابلے میں ہجوم کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل ان کے لیے مناسب اقدام رہا۔ اس معاملے میں کسی بھی مسلمان کو ہجوم کے ہاتھوں قتل کر کے زیادہ زوردار تاثر قائم کیا گیا۔

ہجوم کے ہاتھوں قتل ایسی موثر اور فیصلہ کن سیاسی تکنیک بن کر سامنے آئی ہے جس نے بھارت بھر میں مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں متاثر کیا ہے۔ اب تک ان واقعات نے مسلمانوں کے مسئلے کے طور پر سیاسی بائیکاٹ پیدا نہیں کی ہے۔ اگرچہ ۲۰۱۹ء کے انتخابات کے لیے کانگریس کے انتخابی منشور میں ہجوم کے ہاتھوں قتل کے واقعات کی روک تھام کا قانون بنانے کی بات کی گئی تھی، لیکن بی جے پی کی حریف سیاسی جماعتوں نے اس معاملے کو سیاسی ایجنڈے کے طور پر انتخابی عمل میں متحرک نہیں کیا۔ عام زندگی میں مسلمانوں کی موجودگی کی منفی تصویر کشی کے ذریعے (جیسا کہ مسلمانوں کے خلاف تشدد کی نئی قسم سامنے آئی ہے)، میرے خیال میں اس عمل نے مسلمانوں کو قوم پرستی کے مخالف برادری یا ''غیر'' کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس عمل نے ہندوتوا نظریے کی سیاست کرنے والی بی جے پی اور اس کے سیاسی حریفوں کے درمیان اب تک کوئی امتیاز پیدا نہیں کیا۔

مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی پر طویل عرصے سے جاری بحث اس نکتے کے گرد گھومتی رہی ہے کہ لوک سبھا میں مسلم ارکان پارلیمان کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ بی جے پی کے عروج نے اس بحث کو نئی سمت دی ہے۔ اب یہ دلیل بھی سامنے آ رہی ہے کہ بی جے پی کے علاوہ بھی تمام سیاسی جماعتیں مسلمان امیدواروں کو انتخابی ٹکٹ دینے میں دلچسپی نہیں رکھتیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ لوک سبھا میں مسلم ارکان پارلیمان کی تعداد صرف ۲۷ ہے۔ یہ سیاسی سرد مہری، مسلمانوں کی سیاسی محرومی میں اضافے کا سبب بنے گی۔

اس سادہ سی وضاحت کا دارومدار مسلمان ارکان پارلیمان اور مسلمان ووٹروں کے درمیان تصوراتی تعلق پر ہے۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اگر مسلمان ووٹروں کو موقع دیا جائے تو وہ مسلمان امیدوار کو ہی ووٹ دے گا۔ اسی طرح، انتخابات میں کامیاب ہو کر آنے والے مسلمان نمائندے متوقع طور پر قانون ساز اداروں میں مسلمانوں کے تحفظات پر مبنی مسائل ہی اٹھائیں گے۔ مسلم نمائندگی کا یہ مثالی تصور قانون سازی کی سیاست کی حقیقت کے خلاف ہے۔

ضروری نہیں کہ مسلمان منتخب نمائندے مسلمانوں کے مفادات کے لیے ہی کام کریں۔ درحقیقت، وہ قانون ساز اداروں (اسمبلیوں) میں کسی سیاست دان جیسا ہی رویہ اختیار کریں گے۔ جس سیاسی جماعت کی وہ پارلیمان میں نمائندگی کرتے ہیں، اسی جماعت کے بیانیے کے مطابق ان کے دلائل، بیانات اور دیگر سیاسی معاملات ہوں گے۔ لہٰذا لوک سبھا میں مسلمان ارکان پارلیمان کی تعداد اور مسلمانوں کی پسماندگی کے درمیان تعلق قائم کرنا تجزیاتی طور پر گمراہ کن ہوگا۔ اس کے برعکس، مسلم سیاسی اشرافیہ، جو مسلم مفادات کے نمائندے ہونے کی دعوے دار ہے اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اساسی تعلق، درحقیقت سیاسی نمائندگی کی مختلف اشکال کو پروان چڑھاتی ہے۔ دورِ حاضر میں بھارت کی سیاست کے دو پیچیدہ نکات، انتخابی مسابقت کی نوعیت اور سیاسی طور پر کچھ رعایت دینا ہو سکتے ہیں۔

لوک سبھا کے انتخابات میں حالیہ برسوں کے دوران سخت مقابلے کی نوعیت نے سیاسی جماعتوں کو مجبور کیا کہ وہ معاشرتی امور جیسے سیاسی زندگی کے اصولوں سے نمایاں انحراف کر دیں۔ کسی پیشہ ور ادارے کی طرح سیاسی جماعتوں نے بھی زیادہ سے زیادہ سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے انتخابی منڈی میں کسی کارپوریٹ فرم کی طرح کا برتاؤ رکھا۔ معاشرے کے محروم طبقوں جیسے خواتین، دلت اور مسلمانوں کی نمائندگی ایک اٹل نظریاتی حقیقت ہے۔ لیکن سیاسی جماعتوں نے زیادہ توجہ انتخابی حلقوں میں کامیابی پر مرکوز رکھی۔ بی جے پی نے انتخابی سیاست میں نئی مثال قائم کی اور سیاسی سرگرمیوں، خاص کر انتخابات کو ادارہ جاتی اور پیشہ ورانہ انداز میں برتا۔ بی جے پی کی حریف سیاسی جماعتوں کو بھی اپنی بقا کے لیے اس پیشہ ورانہ معیار کو برقرار رکھنا ہوگا، کم سے کم ان ریاستوں میں تو ضرور، جہاں ان کا براہ راست مقابلہ بی جے پی سے ہے۔ ایسے مواقع پر مسلمان امیدواروں کو ٹکٹ دینا، بھارت میں بالادستی پر مبنی ابھرتی سیاست کی بنیادی منطق کے خلاف ہے۔ ایسا بھارت جہاں مسلم مخالف ہندوتوا کے نظریے اور قوم پرستی پر مکمل بھروسا کیا جا رہا ہو۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ریاستی نظام کے ایسے مضبوط ڈھانچے میں مسلمان قیادت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ بی جے پی سمیت تمام سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ مسلمان قائدین کو راجیہ سبھا، وقف بورڈ، اقلیتوں کے لیے قائم قومی کمیشن اور دیگر فورمز پر جگہ دیں۔ ریاستی نظام میں مسلمانوں کی موجودگی کو کسی بھی طرح مسلمانوں کی نمائندگی سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔ سیاسی جماعتوں کو چاہیے کہ مسلمان سیاست دانوں سے اچھا مسلمان سمجھتے ہوئے رویہ اختیار کریں اور ان سے توقع رکھیں کہ مسلمانوں سے متعلق مسائل پر وہ اپنی پارٹی کا بیانیہ پیش کریں گے۔ بی جے پی میں مسلمانوں کی نمائندگی بالکل ایسے ہی درست ثابت کی جا سکتی ہے۔ یہ مسلمان سیاسی رہنما مسلمانوں کی نمائندگی پر بی جے پی کا موقف درست انداز میں پیش کریں گے۔

بھارت میں ۲۰۱۴ء کے لوک سبھا کے انتخابات کے بعد مسلمان امیدواروں کی نمائندگی میں دیگر مذہبی گروپوں کی طرح خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوا۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمان بتدریج سیاست سے دور ہوئے اور ووٹ کی طاقت پر ان کا عقیدہ کمزور ہوا۔ لیکن اس عمل کو مسلمانوں کے ووٹ دینے کے مزاج سے جوڑا نہیں جا سکتا۔ طبقات، ذات، خطے اور جنس جیسے سماجی اور ثقافتی عناصر مختلف پیرائے میں مسلمانوں کے سیاسی انتخاب کا تعین کرتے ہیں۔ اس طرح، مسلمان ووٹر کئی جہتی سیاسی شناخت رکھتے ہیں اور انتخابی عمل میں ان کی

بقیہ: مسلم وتیا کی سیاست

قوم کا سفارتی رخ اس وقت زیادہ متوازن اور جامع ہوتا ہے، جب اس کی خارجہ پالیسی ترتیب دینے والے منصوبہ سازوں کے سامنے متنوع معاشی، سماجی و ثقافتی اور سیاسی عناصر موجود ہوتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے بہت سے دوست ممالک کشمیر کے معاملے پر اس کے ساتھ نہیں ہیں۔ تاہم عمومی طور پر عالمی برادری نے مقبوضہ وادی میں بڑھتے ہوئے مظالم اور حقوق انسانی کی خلاف ورزیوں پہ شدید غم و غصے کا اظہار کیا ہے۔ حقوق انسانی کی تنظیموں اور میڈیا کے علاوہ بھی بہت سے عالمی اداروں نے اس معاملے پر اپنی حساسیت کا اظہار کیا ہے۔ یقیناً اس سب کے نتیجے میں بھارت پہ دباؤ میں اضافہ ہوا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مسئلہ کشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں پہ عملدرآمد ہو جائے گا۔ یہ پاکستان کی سفارت کاری کا ایک چیلنج ہے کہ وہ دو متحارب مسلم اتحادوں کے درمیان اس مسئلے پر اپنے لیے ایک واضح حمایت حاصل کرنے کی کامیاب کوشش کرے۔

(بحوالہ: ''تجزیات ڈاٹ کام''۔ ۱۲ فروری ۲۰۲۰ء)

شمولیت کا تعین ان عوامل سے کیا جاسکتا ہے۔

سیاسی فتووں اور مذہبی اشرافیہ یا علما کی جانب سے تجاویز کا بڑے پیمانے پر انکار اس تکثر کو سمجھانے کے لیے اچھی مثال ہے۔ انتخابی فتووں کے لیے مشہور، جامع مسجد دلی کے امام، احمد بخاری نے فیصلہ کیا کہ حالیہ انتخابات میں کسی سیاسی جماعت کی حمایت نہیں کریں گے۔ لیکن ممبئی کے علما اس سلسلے میں پیش پیش رہے۔ سنی، شیعہ، بوہری اور وہابی، دیوبندی اور بریلوی مسالک کے سات سو علمائے کرام نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ ۲۰۱۹ء کے انتخابات میں بی جے پی کے مقابلے میں صرف سیکولر جماعتوں کو ووٹ دیں۔ دلچسپ پہلو یہ رہا کہ ان بیانات کا مسلمان ووٹروں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ انہوں نے صرف بی جے پی کو شکست دینے کی نیت سے ووٹ نہیں ڈالا، نہ ہی ووٹنگ کے لیے کوئی خاص حکمت عملی اختیار کی۔

اس کے برعکس، ۲۰۱۴ء کے ریاستی انتخابات کے بعد اور ۲۰۱۹ء کے لوک سبھا کے الیکشن میں مسلمانوں کا ووٹ دینے کا انداز یہ بات واضح کرتا ہے کہ مسلمانوں نے ووٹ بینک بننے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ درحقیقت، سیاسی نسبت مسلمان ووٹروں کے انتخابی طرزِ عمل کے طے شدہ پہلوؤں کا حصہ رہی ہے۔ مسلمانوں نے ان انتخابات میں بی جے پی سمیت تمام سیاسی جماعتوں کو ووٹ دیے۔ اگرچہ بھارت بھر میں بی جے پی کی سیاسی حریف جماعتیں اور علاقائی اتحاد مسلمان ووٹروں کا پہلا انتخاب رہے۔ راجستھان، مدھیا پردیش اور گجرات جیسی ریاستوں میں بی جے پی کے لیے مسلمانوں کے ووٹ میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔

یہ نکتہ ہمیں اس مقالے کی مرکزی دلیل کی طرف لاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مسلمان ووٹر انتخابی بیانیے اور اس کی حیثیت میں واضح امتیاز کر بیٹھے ہیں۔ مسلمانوں نے اس دعوے کو واضح طور پر مسترد کر دیا ہے کہ ہندو ووٹ بینک قائم ہو گیا ہے اور اب انتخابات میں کامیابی کے لیے کسی کو مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت نہیں۔ تاہم ہندوتوا کے نظریے سے انکار کے باوجود وہ متحد ہو کر ووٹ بینک میں تبدیل نہیں ہو سکے۔ ذات پات اور خطے جیسے عناصر اب بھی مسلمانوں کے ووٹ دینے سے متعلق رجحان کا تعین کر رہے ہیں۔ ہندوتوا کے نظریے نے فرقہ وارانہ تفریق کو ہوا دی، لیکن مباحثے کی حد تک، اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں انتخابی میدان میں ردعمل پیدا نہیں ہو سکا۔

اس لیے میں اس دلیل پر قائم ہوں کہ مسلمانوں کا ووٹ یقینی طور پر معنی رکھتا ہے، کیوں کہ بنیادی طور پر مسلمان اپنی پہچان کسی مذہبی گروہ کی حیثیت سے کرانا نہیں چاہتے۔

❁❁❁

بقیہ: امریکیوں کی ''معصومیت'' رخصت ہوئی

مصنف کا سوانحی خاکہ

فلسفے کے طالب علم کی حیثیت سے عملی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد کشور محبوبانی نے سفارت کاری کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نام کمایا۔ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں سنگاپور کی وزارت خارجہ سے وابستگی اختیار کی اور ۲۰۰۴ء میں ریٹائر ہوئے۔ سفارت کار اور تجزیہ نگار کی حیثیت سے ان کا کیریئر قابل رشک رہا ہے۔ انہوں نے کمبوڈیا، ملائیشیا اور واشنگٹن میں خدمات انجام دیں۔ جنوری ۲۰۰۱ء اور مئی ۲۰۰۲ء میں انہوں نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے صدر کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۴ء سے ۱۹۸۹ء اور پھر ۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۴ء تک انہوں نے اقوام متحدہ میں سنگاپور کے مستقل مندوب کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

کشور محبوبانی نے ۱۹۶۷ء میں صدارتی اسکالرشپ حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء میں انہوں نے سنگاپور یونیورسٹی سے فلسفے میں فرسٹ کلاس میں آنرز کیا۔ کینیڈا کی ڈیلہوزی یونیورسٹی سے انہوں نے ۱۹۷۶ء میں ماسٹرز ڈگری لی۔ یہ ڈگری بھی فلسفے میں تھی۔ ۱۹۹۱ء سے ۱۹۹۲ء تک وہ امریکا کی ہارورڈ یونیورسٹی کے سینٹر فار انٹرنیشنل افیئرز کے فیلو رہے۔ ۱۹۹۵ء میں کینیڈا کی ڈیلہوزی یونیورسٹی نے انہیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ سنگاپور کی حکومت نے انہیں ۱۹۹۸ء میں پبلک ایڈمنسٹریشن (گولڈ) میڈل دیا۔ جون ۲۰۰۴ء میں انہیں نیو یارک میں فارن پالیسی ایسوسی ایشن میڈل دیا گیا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کشور محبوبانی اگست ۲۰۰۴ء میں نیشنل یونیورسٹی آف سنگاپور میں لی کوآن یو اسکول آف پبلک پالیسی کے ڈین مقرر ہوئے۔ سنگاپور اور امریکا کے کئی اداروں کے وہ مشیر ہیں۔ معروف امریکی جریدے ''فارن افیئرز'' میں ان کا پہلا مضمون ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا تھا۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل جرائد میں ان کے درجنوں مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ برطانوی جریدے دی اکانومسٹ اور امریکی جریدے ٹائم میں ان کا پروفائل موجود ہے۔ اب تک کشور محبوبانی کی ۶ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

❁❁❁

بقیہ: تیونس: قابلِ مثال

اداروں پر اپنا اعتماد قائم کرنے میں ناکام ہوئے۔ تاہم معیشت کو ٹھیک کرنے کا کام اگر پہلے انجام پا جاتا تو وہ بھی نقصان دہ ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ ایسی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ معیشت کی بحالی کے بعد یہ رہنما جمہوریت کی بحالی کے وعدوں پر قائم رہتے۔ جمہوریت کے سفر میں معاشی چیلنجوں کا سامنا ناگزیر تھا، تاہم ایسے وقت میں عوام کو جمہوریت کی حمایت میں کھڑا رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ دیگر ممالک براہ راست سرمایہ کاری اور مالی امداد کے ذریعے متاثرہ ملک کی پشت پناہی جاری رکھیں۔

تیونس مشرق وسطیٰ میں جمہوریت کی حامی تحریکوں کے لیے امید کی ایک کرن ہے۔ لیکن جمہوریت کی جانب یہ کامیاب سفر خطے کے آمروں کے لیے خطرے کی ایک گھنٹی بھی ہے، کیوں کہ انہیں بھی اس طرح یا اس سے بھی برے حالات کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ بن علی کی سعودی عرب میں جبری ریٹائرمنٹ ان آمروں کے لیے قابل رشک تو نہیں ہے، لیکن عوامی دباؤ کے سامنے نہ جھکنے والوں کو ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ نتائج اس سے قدرے بہتر ہیں جو دیگر آمروں کو دیکھنے پڑے، جیسا کہ معمر قذافی عسکریت پسندوں کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے، ایک آمر کا ملک شام خانہ جنگی کا شکار ہو گیا، معیشت تباہ ہو گئی اور کچھ ایسا ہی یمن کے علی عبداللہ صالح کے ساتھ بھی ہوا۔ اب اگر کسی حکمران کو بڑے پیمانے پر عوامی مظاہروں کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو اس کے سامنے ان حکمرانوں کا انجام ضرور آتا ہوگا۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"The Tunisia Model".
("Foreign Affairs", November/December 2019)

بقیہ: جنوب مشرقی ایشیا میں چین کا بڑھتا اثر و رسوخ

ٹرانسنگل اسپیشل اکنامک زون کے قیام کے وقت چاول کی کاشت سے وابستہ سو سے زائد گھرانوں کو، جن کا تعلق بان کوان نامی گاؤں سے تھا، ان کی مرضی کے خلاف منتقل ہونے کو کہا گیا۔ اسپیشل اکنامک زون میں قانون کے نفاذ کا معاملہ بھی ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں یہ خصوصی علاقے کاروباری افراد کے ساتھ ساتھ جرائم پیشہ افراد کے لیے بھی خاصے پرکشش ہوتے ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں امریکی حکام نے بتایا کہ گولڈن ٹرانسنگل اسپیشل اکنامک زون منشیات اور انسانی اسمگلنگ، منی لانڈرنگ، رشوت اور جنگلی حیات کی غیر قانونی تجارت کا گڑھ تھا۔ انہوں نے اس اسپیشل اکنامک زون کو چلانے والی کمپنی کو ''ٹرانس نیشنل کرمنل آرگنائزیشن'' کا نام دیا اور اس کے چیئرمین ژاؤ وائی (Zhao Wei) پر پابندیاں بھی عائد کیں۔ ژاؤ وائی نے الزامات کو بے بنیاد قرار دیتے ہوئے پابندیوں کو یک طرفہ، نامعقول اور جابرانہ قرار دیا۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"South-East Asia is sprouting Chinese enclaves".
("The Economist", Jan. 30, 2020)

مستقبل کا فلسطین: دبئی یا لبنان؟

حسین عبدالحسین

ذرا ۲۰۲۰ء میں پیچھے چلتے ہیں۔ عرب لیگ زمین کے بدلے امن اقدام کی توثیق کرتی ہے۔ مرحوم فلسطینی صدر یاسر عرفات ٹی وی پر براہ راست قریب قریب چلاتے ہوئے سنے جاسکتے ہیں: ''شہید، شہید، شہید''۔ وہ اس وقت رام اللہ میں اسرائیلی فوج کے محاصرے میں تھے اور اپنے کمرۂ استراحت سے بول رہے تھے۔

تب مغربی صحافی لبنان میں مہاجر کیمپوں میں کود پڑے تھے تاکہ وہ عرب لیگ کے سربراہ اجلاس کی کوریج میں اپنا اپنا رنگ ڈال سکیں۔ میں اس وقت ان کے ترجمان کا کردار ادا کررہا تھا اور بتا رہا تھا کہ فلسطینی دنیا کو کیا بتانا چاہتے ہیں۔

انہیں بڑی چابیاں اور گھروں کے عثمانی عنوانات دکھانے کے بعد فلسطین میں تنہا چھوڑ دیا گیا۔ پھر مہاجرین نے اپنی آخری سانسوں تک حقِ واپسی کے لیے لڑنے کی قسم کھائی لیکن جب کیمرے بند ہوئے تو ان میں سے ایک مجھے ایک طرف لے گیا اور یوں گویا ہوا: ''میری بیٹی جرمنی میں رہ رہی ہے۔ شاید تمہارے صحافی دوست مجھے میری بیٹی تک پہنچانے میں کوئی مدد کرسکیں''۔

لبنان میں پلا بڑھا ہونے کے ناتے، جہاں فلسطینیوں کا سب سے بڑا مطالبہ معمول کا پُرامن حل ہوتا، میں یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ میرے مہاجر فلسطینی دوست لڑنا چاہتے تھے لیکن صرف کیمرے کے سامنے۔ حقیقی زندگی میں، ہم سب کی طرح وہ ایک شائستہ زندگی چاہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ میں جب جب فلسطینیوں سے ملتا رہا ہوں تو انھوں نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی واضح نظر اپنے مفادات پر ہوتی ہے، نہ کہ خالی خولی قومی نعروں پر۔

۲۰۰۷ء میں جب سلام فیاض کو فلسطینی اتھارٹی کا وزیراعظم نامزد کیا گیا تو اس کے بعد ان فلسطینیوں نے ایک وقفہ لیا تھا اور یہ منظرنامے پر ''فیاض ازم'' کا نتیجہ تھا۔ ان کی سلسلہ وار اصلاحات سے اقتصادی ترقی ہوئی۔ یہ فلسطینیوں کی اب تک کی سب سے بہترین حکومت رہی ہے لیکن انتخابات کی عدم موجودگی اور سلام فیاض کے پیچھے کوئی اتحاد کارفرما نہ ہونے کی وجہ سے فتح تحریک اور حماس نے انھیں نکال باہر کرنے کے لیے سازش کی اور حسبِ معمول کرپٹ انداز میں حکومت کے پیچھے لگ گئے۔

صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا امن منصوبہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس میں فلسطینیوں کے حقیقی مسئلے سے پہلوتہی کی گئی ہے۔ کیا انھیں اس منصوبے کو قبول کرلینا چاہیے۔ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو انھیں فلسطینی سرزمین کا صرف ۱۵ فیصد ہی ملے گا۔ ان کی ریاست بمشکل ہی خودمختار ہوگی اور آزاد تو بالکل بھی نہیں۔

فلسطینیوں کی تشویش اور تحفظات جواز کے حامل ہیں۔ اگر آج کی دنیا میں اقتصادی ترقی اور نشوونما کے لیے اراضی پیشگی بنیادی ضرورت ہے تو شاید ایک صدی قبل جب فلسطین اسرائیل تنازع پہلی مرتبہ پیدا ہوا تھا تو اس وقت بھی یہی معاملہ تھا اور اس کے بعد آنے والے عشروں میں بھی یہی معاملہ رہا ہے۔

مگر عالمگیریت نے زراعتی اور صنعتی شعبوں کو چھوٹے ممالک بشمول اسرائیل سے دیس نکالا دے دیا ہے اور ان ممالک کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی معیشتوں کو ایشیائی شیروں (ایشین ٹائیگرز) سنگاپور اور ہانگ کانگ کے نمونے پر استوار کریں۔ مشرق اوسط میں دبئی اور ابوظہبی نے اس ماڈل کو اپنایا اور شاندار کامیابی حاصل کی ہے اور سعودی عرب بھی اپنے وژن ۲۰۳۰ء کے تحت اسی نمونے پر عمل پیرا ہے۔

صدر ٹرمپ کے وژن میں کوئی زیادہ تفصیل بیان نہیں کی گئی ہے۔ فلسطینی اس کے تحت شاید غرب اردن کے اے اور بی علاقوں کا کنٹرول حاصل کریں گے۔ ۱۹۹۳ء کے اوسلو معاہدے میں کچھ ایسا ہی خاکہ بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں زون کا مل کر کل رقبہ ۲۲۵۶ مربع کلومیٹر بنتا ہے۔ یعنی غرب اردن کے کل ۵۶۴۰ مربع کلومیٹر کا کوئی ۴۰ فیصد۔ اس میں مشرقی القدس کا علاقہ بھی شامل ہے۔ غرب اردن کے اس علاقے میں ۲۸ لاکھ افراد آباد ہیں یا یوں کہہ لیں ۹۷ فیصد فلسطینی ہیں۔ غرب اردن کا باقی علاقہ 'سی' کہلاتا ہے اور تنازع ہے۔ کسی بھی حل کی صورت میں اس علاقے میں شاہراہوں اور سرنگوں کا ایک جال ہوگا۔ اس سے فلسطینی ریاست کو مربوط ہونا چاہیے۔ فلسطینی ریاست کو غزہ کی پٹی کا مختصر مگر دنیا کا سب سے گنجان آباد علاقہ بھی حاصل ہوگا۔ یہاں اس وقت ۳۶۹ مربع کلومیٹر کے رقبے میں ۱۹ لاکھ فلسطینی آباد ہیں۔ فلسطین میں ساڑھے تین لاکھ یروشلمی بھی شامل ہوں گے۔ اس شہر کے ساتھ اس کے شمال مشرق میں واقع علاقے بھی فلسطینی ریاست کا حصہ ہوں گے۔

یوں صدر ٹرمپ کے منصوبے کے مطابق فلسطینی ریاست کا کل رقبہ قریباً تین ہزار مربع کلومیٹر ہوگا اور اس کی آبادی ۵۰ لاکھ نفوس کے لگ بھگ ہوگی۔

اگر ایشیائی ٹائیگر معیشتوں سے موازنہ کیا جائے تو فلسطین سنگاپور سے پانچ گنا اور ہانگ کانگ سے تین گنا بڑا ہوگا۔ فلسطین ۵۰ لاکھ آبادی کے ساتھ سنگاپور سے کم گنجان آباد ہوگا۔ اس کی آبادی ۵۶ لاکھ ہے۔ ہانگ کانگ کی آبادی ۷۴ لاکھ ہے۔ وہ مستقبل کے فلسطین سے زیادہ چھوٹے اور زیادہ گنجان آباد ہیں مگر سنگاپور اور ہانگ کانگ کی موجودہ مجموعی قومی پیداوار (جی ڈی پی) بالترتیب ۳۴۰ ارب ڈالر اور ۳۵۰ ارب ڈالر ہے۔ ان کے مقابلے میں فلسطینی علاقوں کی جی ڈی پی بہت تھوڑی ہے اور ۱۵ ارب ڈالر سے بھی کم ہے۔

کیا فلسطینیوں کو اس ڈیل میں اظہارِ دلچسپی کرنا چاہیے؟ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ۵۰ ارب ڈالر کی موعودہ معاشی امداد میں اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے فلسطینیوں کو تیز رفتار اقتصادی ترقی کا ایک عشرہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے ملازمتوں کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ فلسطینیوں کو اچھی آمدن اور خوشحالی حاصل ہوسکتی ہے۔ یہ سب کچھ خودمختاری اور اپنی زیادہ تر اراضی سے دستبرداری کی قیمت پر ہوگا۔

لیکن اگر خودمختاری کی کوئی قدر و قیمت ہے تو یہ لبنان جیسے ملک کو مکمل خودمختار اور خوشحال بنا چکی ہوتی۔ اس کے بجائے لبنان ٹوٹ رہا ہے، اس کی معیشت زبوں حال ہے، کرنسی روز بروز اپنی قدر کھو رہی ہے اور اس کے لوگ غربت کا شکار ہورہے ہیں۔

صدر ٹرمپ کے امن منصوبے میں فلسطینیوں کے ساتھ گزشتہ ایک صدی کے دوران میں ہونے والی تمام ناانصافیوں کو نظرانداز کیا گیا ہے لیکن یہ انہیں ایک واضح انتخاب بھی دیتا ہے۔ وہ یہ کہ کیا وہ دبئی طرز کی ایک خودمختار (خوشحال) ریاست چاہتے ہیں یا وہ ایک ایسا خودمختار ملک چاہتے ہیں جو لبنان جیسا دکھتا ہو؟

حسین عبدالحسین ایک عراقی، لبنانی کالم نگار اور کلھاری ہیں۔ وہ کویتی روزنامہ الرائے کے واشنگٹن میں بیورو چیف ہیں۔

(بحوالہ: ''العربیہ ڈاٹ نیٹ''۔ ۵ فروری ۲۰۲۰ء)

مسلم دنیا کی سیاست

محمد عامر رانا

حالیہ دنوں میں ملائشیا کے دورے کے دوران وزیراعظم عمران خان نے اس امر کا اعتراف کیا کہ انہوں نے دسمبر میں کوالالمپور میں ہونے والی مسلم ممالک کی کانفرنس میں اس لیے شرکت نہیں کی تھی کہ پاکستان کے بعض دوست ممالک کو یہ خدشہ تھا کہ یہ کانفرنس مسلم دنیا کو تقسیم کرنے کے مقصد سے بلائی گئی ہے۔ وزیراعظم کا اشارہ ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان کی جانب تھا کہ جنہوں نے انہیں مدعو کیا اور یہ باور کروایا کہ وہ اس کانفرنس سے دور رہیں کیونکہ ان کے نزدیک اس کانفرنس کے روح رواں ایران، ترکی اور قطر ہیں، جنہیں سعودی سلطنت مسلم دنیا میں اپنے اثر ورسوخ کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہے۔ پاکستان کے لیے یہ ساری صورتحال خوش آئند نہیں تھی جو کہ پہلے ہی مسلم دنیا میں ابھرتے ہوئے دو متحارب سیاسی اتحادوں کے مابین توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں الجھا ہوا ہے۔ اس کے سبب مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی سفارتی کوششوں کو بھی ضرب لگی ہے۔ پاکستان کا جغرافیائی و معاشی محل وقوع اور اس کو درپیش اسٹریٹیجک خطرات اسے اس امر کی مکمل اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان دو متحارب اتحادوں میں سے کسی بھی ایک کو مکمل خوش یا ناراض کردے۔ پاکستان کے لیے مشکل و پیچ یہ ہے کہ اس کا دل ملائشیا اور ترکی کے سیاسی اتحاد کی جانب ہے، جو کہ مسئلہ کشمیر پر اس کے غیر مشروط حمایتی ہیں لیکن اس کا دماغ سعودی قیادت میں قائم سیاسی اتحاد میں اٹکا ہوا ہے کیونکہ وہاں سے معیشت کے اس مشکل دور میں مالی امداد مہیا ہوتی ہے۔

تاریخی تناظر میں پاکستان سعودی عرب و ایران تنازع میں دونوں فریقین سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں کامیاب رہا ہے اور اس دوران اس کو دونوں جگہ اپنی بات کہنے کی آزادی بھی رہی ہے۔ تاہم گزشتہ چند برسوں سے مسلم اُمہ میں ابھرتے ہوئے ان دو متحارب اتحادوں کے آپسی سطح پہ بگڑتے ہوئے تعلقات نے پاکستان کے لیے درمیانی راہ کو بہت حد تک مشکل بنا دیا ہے اور اب اس کے لیے دونوں جگہ اپنی بات کہنا یا منوانا مشکل ہوگیا ہے اور یہ سب کچھ ایسے وقت میں رونما ہوا، جب پاکستان کے پاس ایک ایسا وزیراعظم ہے جو بظاہر اپنے جذبات پہ قابو پانا نہیں جانتا۔ اسی اثنا میں ملک کی معاشی و تزویراتی مشکلات اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ اب وزیراعظم کے پاس یہ سہولت نہیں رہی کہ وہ عوامیت پسندی کی راہ اپنا سکیں۔ یہ پاکستان کی مجبوری ہے کہ وہ ان دو متحارب مسلم اتحادوں سے تعلقات بڑھاتے ہوئے محتاط رہے جو کہ پوری مسلم دنیا میں سیاسی، معاشی، مذہبی اور مسلکی میدانوں میں ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں، عوامیت پسند سیاسی رجحان ایسے معاشروں میں بہت شہرت پا رہا ہے جہاں متوسط طبقہ (کاروباری وملازمت پیشہ) پھیل رہا ہے اور وہاں شناخت کے بحران جنم لے رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ایک عوامیت پسند سیاسی رہنما کے لیے بہت کچھ کہہ دینا آسان ہوتا ہے۔ پاکستان کے حالات ایسے ہیں کہ یہاں کے حکمرانوں کو سفارتی لب ولہجہ اختیار کرتے ہوئے مستقل اور منطقی نکتہ نظر اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ اسی لیے یہ پاکستان کی مجبوری ہے وہ ان دو متحارب مسلم اتحادوں سے تعلقات بڑھاتے ہوئے محتاط رہے۔

منتشر مسلم اُمہ کی کہانی کوئی نئی نہیں ہے۔ اسی طرح متمول مسلم ممالک کی دیگر مسلم معاشروں میں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سیاسی، مذہبی اور معاشی اثر ورسوخ بڑھانے کی جدوجہد کی کہانی بھی نئی نہیں ہے۔ مسلم دنیا میں جہاں کہیں بھی سنی شیعہ تقسیم موجود ہے، وہاں ایران اور سعودی عرب کی جانب سے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں چنگاریاں سلگائے رکھنا ایک خطرناک سیاسی چال رہی ہے۔ اب ایسا لگ رہا ہے کہ ترکی معتدل حنفی اسلام پہ اپنا حق جتاتے ہوئے ایک ایسے مسلم گروہ کا محافظ بن رہا ہے، جو مسلم دنیا میں غالب اکثریت رکھتا ہے۔ ترک مذہبی طبقہ واضح انداز میں حنفی اسلام کی برتری کا بیانیہ اپنا رہا ہے۔ قطر اسلام میں سلفی فکر کو اپنا نیا رنگ دے رہا ہے اور اس دوران اسلام پسندوں کا اپنے جغرافیائی و سیاسی مقاصد میں حوصلہ بڑھا رہا ہے۔ ایران کا ایک اپنا مذہبی تصور ہے اور ایک تہذیبی شعور ہے۔ جس کے سبب وہ اپنے سیاسی کردار پہ فخر بھی کرتا ہے۔ ملائشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد اس طور فخر کرتے ہیں کہ وہ مشرقی اقدار کے سپہ سالار ہیں۔ ان کا شمار ''ایشین ایکسپشنلزم'' ایشیا کی غیر معمولیت کے ابتدائی رہنماؤں میں ہوتا ہے، جنہوں نے ۹۰ کی دہائی میں جمہوریت اور حقوق انسانی جیسے عالمی تصورات کو چیلنج کیا تھا۔ سنگاپور کے وزیراعظم لی کیوان یو کے ساتھ مل کر مہاتیر محمد نے مغربی بیانیے کو چیلنج کیا اور یہ ثابت کیا کہ معاشی کامیابی اور آزادی مغربی ماڈل کی نقل کیے بغیر بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پاکستان کے لیے فخر مند کیا ہے؟ ایٹمی ہتھیار؟ ایک کمزور معیشت اور پیچیدگیوں سے بھرپور ہمسائے؟ ممکنہ طور پر ''مسلم امہ'' کے راہنماؤں کے لیے پاکستان کو اس لیے بھی نظرانداز کرنا آسان نہ ہوگا کہ اس کے پاس بڑی منظم فوج اور وسیع مارکیٹ ہے۔ اگر ہمارے پاس معاشی اور سیاسی استحکام ہوتا تو ہمیں خطے میں پراکسی جنگوں کا حصہ بننے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پاکستان شاید مسلم امہ کی سربراہی کے لیے ایک مضبوط ترین ملک ہوتا جس کے پاس ایک اور ہی طرح کا سفارتی انداز ہوتا۔ تاہم یہ کوئی مثالی دنیا نہیں ہے اور پاکستان کو وہی رخ اختیار کرنا ہوگا، جو اس کے مفادات کو پورا کرنے میں معاونت کرے۔ پاکستان کے لیے امکانات واضح کرنا تو بہت آسان ہے لیکن بطور ملک ان میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک جانب سعودی قیادت میں ایک سیاسی اتحاد ہے، جس نے بہت سے مواقع پہ پاکستان کی معاشی امداد کرتے ہوئے اسے دیوالیہ ہونے سے بچایا اور یہاں پاکستانی کارکنوں کی ایک بڑی تعداد مقیم ہے۔ پاکستان کے ساتھ قریبی دفاعی تعلقات کے ساتھ ساتھ سعودی عرب کے واشنگٹن، بیجنگ اور دلی میں بھی قریبی تعلقات ہیں، جنہیں بوقت ضرورت بروئے کار لایا جاسکتا ہے۔

ایران ہمسایہ ملک ہے جس کے پاس یہ گنجائش ہے کہ وہ ہمیں توانائی کے شعبے میں مسلسل معاونت کرسکتا ہے لیکن اس کی بھی ایک قیمت ہے۔ ملائشیا پاکستان کا نیا اتحادی ہے۔ ترکی کی طرح اس کی نظریں بھی پاکستانی مارکیٹ پہ ہیں۔ بعض ماہرین کی رائے میں ملائشیا کی جانب سے مسئلہ کشمیر پر پاکستان کی حمایت پاکستانی مارکیٹ میں اپنا مقام بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ پاکستان کے لیے امکانات واضح کرنا تو بہت آسان ہے لیکن بطور ملک ان میں فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ کیا اسے ترکی و ملائشیا کے سنگ جانا چاہیے؟ یا حقیقی دنیا میں رہتے ہوئے معیشت اور سیاست کی تلخ سچائیوں کے تحت سعودی اتحاد میں شامل ہونا چاہیے؟ یا اسے اسی طرح ایک تنی ہوئی رسّی پہ سوار رہنا چاہیے؟ مگر جو کوئی بھی راہ پاکستان اختیار کرتا ہے وہ قومی حمیت اور غیرت پہ سمجھوتہ کرکے نہیں اپنانی چاہیے۔ کشمیر آج بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی کا اہم ستون ہے، لہٰذا یہ ملکی حمایت حاصل کرنے کا ایک آسان ذریعہ ہے۔ لیکن یہ جغرافیائی و معاشی اور تزویراتی مفادات کے لیے کافی نہیں ہے۔ کسی بھی

باقی صفحہ نمبر ۱۱

بھارت جنگ چھیڑنے کے دہانے پر!

ولسن سینٹر میں ایشیا پروگرام کے ڈپٹی ڈائریکٹر مائیکل کگلمین کا ''دی ریویو'' میں اظہار خیال

رضوان شہزاد

کسی کو بیک وقت پاکستان اور بھارت کا ایجنٹ کہنا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سوں کو اُن کے خیالات یا موقف کی بنیاد پر بیک وقت پاکستان اور بھارت کا ایجنٹ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ واشنگٹن میں قائم تھنک ٹینک ''ولسن سینٹر'' میں ایشیا پروگرام کے ڈپٹی ڈائریکٹر مائیکل کگلمین اس حوالے سے منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ ٹرپل ایجنٹ کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ اُنہیں افغانستان کا بھی ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے۔

ایکسپریس نیوز کے ٹاک شو ''دی ریویو'' میں اظہار خیال کرتے ہوئے مائیکل کگلمین نے کہا ''میں جو کچھ کہتا ہوں اگر واقعی اُس پر قائم ہوں تو پھر مجھے یہ بھرپور تاثر دینا چاہیے کہ میں کوئی اچھا کام کر رہا ہوں۔ میں پاکستان، بھارت اور افغانستان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ تینوں ملکوں کے حالات کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد مجھے جو رائے دینی ہے اُس میں اگر کسی ملک پر تھوڑی بہت تنقید بھی جائز ہے تو مجھے اُس سے گریز نہیں کرنا چاہیے''۔

اس ٹاک شو میں مائیکل کگلمین نے امریکا کی پالیسیوں کے علاوہ پاکستان، بھارت اور افغانستان کے حالات اور ان کے باہمی تفاعل پر تفصیل سے بات کی۔ جب اُن سے پوچھا گیا کہ کیا وہ ٹرپل ایجنٹ ہونے کے الزام کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں تو مائیکل کگلمین نے کہا ''اِس کے سوا کوئی معقول راستہ نہیں۔ اگر میں ایسا نہ کروں تو میری اپنی حوصلہ شکنی ہوگی''۔

جب اُن سے گزشتہ سال دسمبر میں شائع ہونے والے اُن کے ایک مضمون کے بارے میں سوال کیا گیا کہ کیا واقعی ۲۰۲۰ء میں پاک بھارت جنگ ہوسکتی ہے تو اُنہوں نے کہا ''میں نے یہ لکھا تھا کہ دونوں ممالک کے درمیان جنگ کا امکان ہے مگر یہ نہیں لکھا تھا کہ جنگ ہو کر ہی رہے گی''۔

اپنے نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے مائیکل کگلمین نے کہا ''پاک بھارت تعلقات میں اِس وقت جو کشیدگی ہے وہ تو پلوامہ میں فوجیوں کی ہلاکت اور اس کے بعد بالاکوٹ کے واقعے کے وقت بھی نہیں تھی۔ بھارتی آئین سے آرٹیکل ۳۷۰ کے ختم کیے جانے سے معاملات میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے، وہ بہت بڑی ہے۔ اس تبدیلی کو ''گیم چینجر'' کہنا زیادہ درست ہوگا۔ اس وقت معاملات اِتنے بگڑے ہوئے ہیں کہ کوئی بھی بڑا سانحہ رونما ہو تو بہت بڑے پیمانے پر تصادم کو ٹالنا ممکن نہ رہے گا۔ پلوامہ اور بالاکوٹ کے معاملے میں تو امریکا اور چند دوسرے بڑے انٹرنیشنل پلیئرز نے ثالثی اور مصالحت کی پیشکش کی تھی تاکہ خطے میں کشیدگی کا گراف نیچے لایا جاسکے۔ اس بار ایسا کرنا خاصا دشوار ہوگا کیونکہ اس بار بھارت کچھ کر گزرنے کے لیے کسی بڑی مہم جوئی کے موڈ میں دکھائی دے رہا ہے''۔

''بھارت میں انتہائی اعلیٰ سطح کے افسران اور حکومتی شخصیات کی طرف سے خاصے بڑھک آمیز بیانات سامنے آئے ہیں اور اب تو آزاد کشمیر پر تصرف قائم کرنے کی بھی باتیں کی جارہی ہیں۔ ایسی باتیں پہلے بھی سنائی دیتی رہی ہیں مگر اب کے شدت کچھ زیادہ، بلکہ خطرناک ہے''۔

گزشتہ ماہ بھارت کے آرمی چیف جنرل منوج مکند نروانے نے ایک بیان میں کہا تھا کہ حکومت حکم دے تو آزاد کشمیر پر بھی قبضہ کیا جاسکتا ہے۔ بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی نے بھی ایک بیان میں کہا ہے کہ پاکستان کو صرف دس دن میں دھول چاٹنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ اس بیان کا پاکستانی قیادت نے خوب تمسخر اڑایا۔ بھارتی قیادت بڑھکیں مارنے پر تُلی ہوئی ہے اور دوسری طرف بھارتی فوج کنٹرول لائن پر صورت حال کو زیادہ کشیدہ اور خطرناک بنانے پر کمربستہ ہے۔ جنگ بندی معاہدے کی خلاف ورزیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

جب مائیکل کگلمین سے پوچھا گیا کہ کیا واقعی بھارت جنگ چھیڑ دے گا تو انہوں نے کہا ''یہ بات تو نہیں کہی جاسکتی کہ بھارت جنگ چھیڑ ہی دے گا تاہم صورت حال کی نوعیت کہہ رہی ہے کہ کچھ بھی ہوسکتا ہے کیونکہ بھارتی قیادت نے اب سے پہلے اس نوعیت کا لہجہ اختیار نہیں کیا۔ کشمیر کی آئینی حیثیت کی تبدیلی، شہریت سے متعلق متنازع قانون کی منظوری اور رام جنم بھومی مندر کی تعمیر کا معاملہ..... یہ تمام معاملات بتا رہے ہیں کہ اب صورت حال بہت مختلف ہے۔ ایسے میں اگر بھارتی قیادت کوئی بڑی مہم جوئی کر گزرے تو حیرت نہ ہوگی''۔

مائیکل کگلمین کی باتوں سے پاکستان کے اس خدشے کی تصدیق ہوتی ہے کہ بھارت جنگ کے لیے بہانہ تلاش کرنے کے نام پر کوئی بھی ایسی ویسی واردات کرسکتا ہے۔ وزیراعظم عمران خان نے بارہا کہا ہے کہ انتہا پسند و رجعت پسند ہندو تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ کے تربیت یافتہ نریندر مودی علاقائی ہی نہیں، عالمی امن کے لیے بھی خطرہ ہیں۔

مبصرین کا کہنا ہے کہ بھارت کو فرانس سے جدید ترین رافیل طیاروں اور روس سے ایس۔۴۰۰ میزائل سسٹم کے حصول تک انتظار کرنا پڑے گا۔ فی الوقت بھارت پاکستانی فضائیہ سے مسابقت کی پوزیشن میں نہیں۔

ایک سوال کے جواب میں مائیکل کگلمین نے کہا ''عمران خان کی قیادت میں قائم ہونے والی حکومت کو بنیادی طور پر معیشت کی سمت درست کرنی تھی اور ملک کو خوشحالی کی راہ پر ڈالنا تھا، مگر ایسا لگتا ہے کہ اُن کے پاس ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں اور وہ تیزی سے پیچیدہ ہوتے ہوئے معاشی مسائل حل کرنے کی بھرپور اور مطلوبہ قابلیت نہیں رکھتے''۔

''معیشت کے معاملے میں حکومت ناکامی سے دوچار ہوئی ہے تاہم یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ عمران خان نے پلوامہ اور بالاکوٹ کے بحران سے نمٹنے کے معاملے میں اچھی بصارت کا مظاہرہ کیا۔ عالمی برادری نے انہیں امن کی خواہش کے حوالے سے خوب سراہا''۔

پاک امریکا تعلقات اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سے ڈیووس میں اقتصادی فورم کے اجلاس کے موقع پر عمران خان کی ملاقات کے حوالے سے مائیکل کگلمین نے کہا ''اس وقت پاک امریکا تعلقات بہت اچھی حالت میں ہیں، مگر یہ کہنا غلط ہوگا کہ جتنے اچھے اس وقت ہیں اُتنے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے کہا ہے کہ اس وقت پاک امریکا تعلقات جس مقام پر ہیں اُتنے اچھے پہلے کبھی نہیں تھے۔ یہ بات درست نہیں ہے۔ امریکا نے پاکستان کے لیے سلامتی سے متعلق تعاون معطل کردیا تھا۔ یہ اب بھی معطل ہے مگر ہاں، پاکستان نے افغانستان میں امن کی بحالی سے متعلق عمل کو آگے بڑھنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ ہاں، یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ جب ٹرمپ نے صدر کا منصب سنبھالا تھا تب دوطرفہ تعلقات جس نہج پر تھے اُس سے کہیں بہتر آج ہیں''۔

افغانستان میں حقیقی اور دیرپا امن کے قیام کے لیے امریکا کو پاکستان کی ضرورت ہے۔ جب افغانستان میں امن مکمل طور پر بحال ہو جائے گا اور وہاں امریکی فوجی بھی تعینات نہیں رہیں گے تب پاک امریکا تعلقات کا کیا بنے گا؟ کیا تب بھی امریکی پالیسی ساز پاکستان کو غیر معمولی سطح پر اہم

باقی صفحہ نمبر ۶

اسرائیلی فوجی اہلکار تو بڑے ہی بے وقوف نکلے!

رافعہ ذکریا

گزشتہ سو سال فلسطینیوں کے لیے کسی بھی طور اچھے نہیں رہے۔ چند تاریخ دانوں کے بقول فلسطینیوں کی مشکلات کا آغاز ۱۰۳ برس قبل اس بالفور ڈیکلیریشن کے ساتھ ہوا جس کے تحت اسرائیلی یہودیوں کو یہودی عوام کے لیے ایک قومی وطن قائم کرنے کا حق دیا گیا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب فلسطین کی کل آبادی میں صرف دس فیصد یہودی تھے، لیکن اس نکتے کو خاطر میں ہی نہیں لایا گیا بلکہ اس نکتے پر نہ تو ۱۹۲۰ء میں اس وقت خاص توجہ دی گئی جب یہ علاقہ برطانیہ کے زیر حفاظت آیا اور نہ ہی ۱۹۴۸ء میں اس وقت کوئی اہمیت دی گئی جب اسرائیلی ریاست کا قیام عمل میں آیا۔ آج تک اس نکتے کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔

اب تو یہودی قبضے اور اس کی بڑھتی آبادی کو ۷۰ سال سے زائد وقت گزر گیا ہے اور اس پورے عرصے میں فلسطینیوں کو سکھ اور چین کے چند دن بھی نصیب نہیں ہو سکے ہیں۔

چند ہفتے پہلے صدر ٹرمپ کے داماد جیرڈ کشنر نے فلسطینیوں سے رائے لیے بغیر ہی ان کے لیے امن منصوبہ پیش کیا۔ یہ منصوبہ پہلے سے پسے ہوئے فلسطینیوں کو مزید نقصان پہنچانے کے لیے کافی تھا، لہٰذا انہوں نے بلاتاخیر اس منصوبے کو مسترد کر دیا۔

برابری کی بنیاد پر مذاکرات کی کوششوں کے فقدان کے بیچ حماس جیسے فلسطینی گروہ اسرائیلی فوجی اہداف کو مختلف طریقوں سے نشانہ بناتے ہوئے نظر آئے۔ حال ہی میں اسرائیلی ڈیفنس فورس (آئی ڈی ایف) نے یہ دعویٰ کیا کہ حماس کے ہیکرز نے اسرائیلی فوجیوں کے اسمارٹ فونز کو ہدف کا نشانہ بنایا ہے۔

ترجمان آئی ڈی ایف کے مطابق ہیکرز نے مرد فوجی اہلکاروں کی توجہ اور دلچسپی حاصل کرنے کے لیے نوجوان خواتین کی تصاویر استعمال کی تھیں۔ ہیکرز نے (خود کو خواتین ظاہر کیا اور پرکشش تصاویر استعمال کرتے ہوئے) مختلف جعلی سوشل میڈیا پروفائلز کے ذریعے فوجی اہلکاروں سے دوستی قائم کرنے کی کوشش کی۔ جب کوئی فوجی اہلکار جھانسے میں آ جاتا تو انہیں یہ بہانہ بنا کر ایک لنک سے فون ایپلیکیشن ڈاؤن لوڈ کرنے کے لیے کہا جاتا تھا کہ چونکہ وہ خواتین تارکِ وطن ہیں اور انہیں عبرانی زبان نہیں آتی لہٰذا اس چیٹ ایپلی کیشن کی مدد سے انہیں فوجی اہلکاروں سے رابطہ رکھنے میں آسانی ہوگی۔

بظاہر متعدد فوجی اہلکاروں نے ان ایپلی کیشنز میں سے کوئی نہ کوئی ایپلی کیشن ڈاؤن لوڈ کر لی تھی۔ کئی ہفتوں بعد جا کر اسرائیلی انٹیلی جنس کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ یہ ایپلی کیشنز متعدد اسرائیلی فوجی اہلکاروں کو ہدف بنا رہی ہیں۔ ایپلیکیشن کے ڈاؤن لوڈ ہونے پر اسمارٹ فون میں ایک ایسا وائرس داخل ہو جاتا جو فون میں محفوظ تمام معلومات تک رسائی حاصل کر لیتا۔ اس کے علاوہ اس وائرس کے ذریعے اسمارٹ فون کے مالک کو پتا چلے بغیر دور سے ہی امیجز اور کیمرا فنکشن میں ساز باز ی، ویڈیوز کا حصول وغیرہ بھی ممکن ہو جاتا تھا۔

اس طریقے سے ہیکرز کو خفیہ سیکیورٹی تفصیلات تک رسائی حاصل ہو جاتی تھی۔ آئی ڈی ایف کے مطابق کئی ماہ قبل ہیکنگ کے اس عمل کا انکشاف ہوا، جس کے بعد فوجی اہلکاروں کو فونز میں سے تمام ایپلی کیشنز ہٹانے کے لیے کہا گیا۔

آئی ڈی ایف نے اس حملے کا الزام حماس سے منسلک فلسطینی ہیکرز پر عائد کیا۔ بقول اسرائیلی افسر، ورچوئل دنیا میں کیے گئے حملوں کے نتائج حماس کو حقیقی دنیا میں بھگتنا ہوں گے۔ بڑے پیمانے پر میڈیا کی زینت بننے والا یہ واقعہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ حماس پہلے بھی مبینہ طور پر اسرائیلیوں کے خلاف سائبر حملے کرتا رہا ہے۔

گزشتہ برس مئی میں بھی اسرائیلی حکومت نے حماس کی جانب سے سائبر حملے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس وقت اسرائیلی حکومت نے حملے کی تفصیلات جاری نہیں کیں اور اس کے ردِعمل میں فلسطینی علاقوں بالخصوص حماس کو فضائی حملوں کا نشانہ بنایا تھا۔

۲۰۱۶ء میں بھی اسرائیل پر سائبر حملہ کیا گیا تھا، اس وقت ہیکرز نے اسرائیلی ٹی وی شو 'بگ برادر' کی نشریات کو ہدف بنایا اور اس میں دہشت گرد حملوں کی فوٹیج شامل کر دیں، جن میں ناظرین کو بتایا گیا کہ یہاں کوئی جگہ محفوظ نہیں اور وہ یہ ملک چھوڑ دیں۔

بلاشبہ ہیکنگ ایک جرم ہے اور اس کو فروغ یا اس کی ترغیب دینا ٹھیک نہیں، مگر حماس کو سائبر حملوں کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر حیرانی نہیں ہوئی۔ چونکہ مغربی ریاستوں کی جانب سے اسے ایک دہشت گرد گروہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے اس گروہ کی جانب سے ایک غیر متوازی جنگ (جس میں فوجی انفرااسٹرکچر اور گولہ بارود کوئی اہمیت نہیں رکھتا) کی طرف بڑھنے کا عمل اس گروہ کے بارے میں قائم کردہ تاثر کے مطابق ٹھیک ہی تو بیٹھتا ہے۔

ہیکنگ کے تازہ واقعے سے حماس کے ہیکر اپنا جال پھیلانے اور فوجی اہلکاروں کو اس میں پھنسا کر معلومات نکلوانے کی انوکھی اور نئی چال بازی استعمال کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

حماس کے پاس ہیکنگ کو اپنے لیے اسٹریٹجک فوائد کے حصول کا ذریعہ تصور کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ بمباری اور راکٹ حملوں سے انسانی جانوں کا نقصان ہوتا ہے اور خوف پھیلتا ہے، لیکن اس کے برعکس ہیکنگ معلومات کی فراہمی کا ذریعہ بنتی ہے اور یہ تکنیکی طاقت کی تعظیم کرتی ہے۔

گزشتہ کئی دہائیوں سے اسرائیلی حکومت انہی بمباریوں اور راکٹ حملوں میں ہونے والی اموات کی بنیاد پر فلسطینی آبادیوں کو مغربی کنارے اور غزہ میں محصور رکھنے کے ظالمانہ اقدامات کو درست قرار دیتی آرہی ہے۔ سائبر جنگ کے انتخاب سے فلسطینی ہیکرز کی وہ ممکنہ طاقت آشکار ہو جاتی ہے جس کے ذریعے اسرائیلیوں کی جان لیے بغیر اسرائیلیوں کا جینا مشکل بنایا جا سکتا ہے۔

آخر میں بات ہو جائے اس حملے کے طریقۂ واردات کی، جس نے یہ واضح کر دیا کہ جب ورچوئل ذرائع پر خواتین سے دوستی رکھنے کی بات آتی ہے تو مرد بشمول اسرائیلی فوجی کتنے بے وقوف بن جاتے ہیں۔

محض کچھ جعلی سوشل میڈیا پروفائلز اور خواتین کی چند تصاویر کی مدد سے ایسے مردوں کو پھانس لیا گیا جنہیں فوجی تربیت دی گئی تھی اور جو اس بات سے واقف تھے کہ ان کے پاس اسمارٹ فونز یا کسی دوسرے طریقے سے محفوظ معلومات کو کبھی بھی ہدف بنایا جا سکتا ہے۔ نہ صرف وہ اس جال میں پھنسے بلکہ ایک عرصے تک انہیں اس بات کی بھنک بھی نہ پڑی۔

حماس کی جانب سے کیے جانے والے ان سائبر حملوں کے بعد دیگر مردوں اور پاکستانی فوجی اہلکاروں کو محتاط ہو جانا چاہیے کیونکہ ان کے برقی آلات کو بھی ایسی کسی چال بازی کے ذریعے ہدف کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ پاکستانی مردوں کی ایک بڑی تعداد ایسے یا اس سے ملتے جلتے جالوں میں پھنس چکی ہے جو ان کی ذات اور اس امکان کو شہہ دیتے ہیں کہ شاید کوئی خاتون ان سے جان پہچان بڑھانا اور ان سے تصاویر کا تبادلہ چاہتی ہے۔

انسانی نفسیات اور ورچوئل ٹیکنالوجی کا یہ بدنما امتزاج اس انوکھی دنیا کی دلیل ہے جس میں ہم رہتے ہیں، جہاں حقیقی اور غیر حقیقی کی سرحدیں مسلسل دھندلی پڑتی جا رہی ہیں، جہاں خواتین مردوں پر ہنس سکتی ہیں اور ان کی کمزوریاں نت نئے اور حیرت انگیز طریقوں سے آشکار ہوئیں۔

"Hamas's hackers". ("Dawn", Feb. 19, 2020)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950